پروازِ ادب

نومبر۔ دسمبر ۱۹۹۲ء

جگر جالندھری

جلد: ۱۴ شمارہ ۱۱-۱۲

مدیرِ اعلیٰ: جے۔ ایس۔ قومی
(آئی۔ اے۔ ایس)

مدیر
مہندر سنگھ بجاج

ناشر
ڈائرکٹر بھاشا وبھاگ
پنجاب۔ پٹیالہ

طابع
کنٹرولر پرنٹنگ اینڈ سٹیشنری
پنجاب

ترسیلِ زر کا پتہ
سیکشن آفیسر
بھاشا وبھاگ پنجاب۔ پٹیالہ
۱۴۷۰۰۱

تخلیقات کی ترسیل کا پتہ
ایڈیٹر اردو بھاشا وبھاگ
پنجاب۔ پٹیالہ ۱۴۷۰۰۱

قیمت

سالانہ: ۲۰-۷ روپے

فی شمارہ: ۲۰-۱ روپیہ

پرواز ادب

نومبر
دسمبر
۱۹۹۲ء

جگر جالندھری
نمبر

ترتیب

• گذارشِ احوال ——— مدیر ——— 3
• آئینہ ——— ادارہ ——— 5
ارشادات۔ تاثرات۔ مقالات 8
• ایک مقبول و نامور شاعر جگر جالندھری ——— امر چند قیس ——— 20
• شاعرِ معجز بیان جگر جالندھری ——— ساحر ہوشیارپوری ——— 30
• لذتِ دردِ جگر ——— کالی داس گپتا رضا ——— 33
• گفتنی ——— پدمن سنگھ ہنر ——— 42
• "دردِ جگر" پر ایک تجزیاتی اور تنقیدی نظر ——— گنپت سہائے سریواستو 47
• جگر جالندھری (ایک منفرد آواز) ——— ہردیال شوق ——— 58
• جگر جالندھری "دردِ جگر" کی روشنی میں ——— ہیرانند سوز ——— 66
• شاعرِ پنجاب ——— جگر جالندھری (فن اور شخصیت) ہربھگوان شاد ——— 71
• مایۂ ناز شاعر جناب جگر جالندھری ——— ہمت رائے شرما ——— 78
• عکسِ جگر ——— شکھدیو راج شرما شنک 84
• پنجاب کے نمایندہ اردو شاعر ——— آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر ——— 89
جناب جگر جالندھری
انتخابِ کلام (غزلیات۔ نظمیات، قطعات) ——— جگر جالندھری 99
• بھاشا وبھاگ کی سالانہ تقریب ——— ادارہ 141
(ایک جائزہ)

مصنف کے خیالات و نظریات سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں

جناب جگتر جالندھری، وزیر اعلیٰ پنجاب، جناب بے انت سنگھ صاحب سے اعزاز حاصل کرتے ہوئے، ان کے ہمراہ وزیر تعلیم جناب ہرنام داس جوہر، کماری (پروفیسر) شوشیل مہاجن وزیر ریاست برائے تعلیم اور شری برہم مہندرا وزیر برائے محکمہ سماج بھلائی پنجاب بھی کھڑے ہیں۔

اداریہ

گذارشِ احوال

بھاشا وبھاگ کو یہ فخر حاصل ہے کہ وہ ہر سال ادیبوں اور فنکاروں کی خدمت میں ایک درجن سے زائد اعزازات پیش کرتا ہے۔ اس سال جس اُردو ادیب کو شرومنی اُردو ساہتکار کا اعزاز دیا گیا ہے وہ کوئی اور نہیں ہے بلکہ اُردو زبان کے جانے مانے شاعر جناب جگر جالندھری ہیں۔ اس اعزاز میں ان کو اکیس [21] ہزار کا کیسۂ زر، خلعت، تمغہ اور سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ اعزاز یافتہ ادباء سے متعلق خصوصی شمارے شائع کرنا "پروانۂ ادب" کی درخشاں روایت رہی ہے۔ اسی سلسلے میں زیرِ نظر شمارہ جناب جگر جالندھری نمبر کے طور پر قارئین کی نذر کیا جا رہا ہے۔

جناب جگر جالندھری پنجاب کے مشہور ادبی دبستان یعنی خانوادۂ جوش ملسیانی سے وابستہ ہیں۔ وہ قبلہ جوش ملسیانی کے علاوہ ان کے ایک اور شاگرد آنجہانی ساحر سیالکوٹی سے بھی باقاعدہ طور پر فیض یاب ہوتے رہے ہیں۔

وہ ایک کہنہ مشق شاعر ہیں اور ایک عرصے سے سامعین سے خراجِ تحسین وصول کرتے آ رہے ہیں۔ زبان و بیان پر ان کو مکمل دسترس حاصل ہے۔ بہت بڑی بات کو چند الفاظ میں کہہ دینے کا ہنر انہیں خوب آتا ہے۔ ان کے کلام میں

روانی، برجستگی اور شگفتگی دیکھتے ہی بنتی ہے۔

جگر ایک خوبصورت شاعر کے ساتھ ساتھ ایک نیک سیرت انسان بھی ہیں۔ جو کوئی بھی ایک دفعہ ان کے قریب آجاتا ہے بس انہیں کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ ان کا یہ شعر ان کی ذات پر پورا صادق آتا ہے۔ ؎

غیر ممکن ہے کہ وہ غیر کا پھر ہو جائے
جگر اک بار جسے اپنا بنا لیتے ہیں

اب تک ان کے چھ مجموعہ ہائے کلام منظرِ عام پہ آچکے ہیں۔ ان میں سوزِ جگر۔ لختِ جگر۔ خونِ جگر اور دردِ جگر کے علاوہ اندازِ جگر اور گُل و خار شامل ہیں۔ آخری دونوں مجموعے دیوناگری رسم الخط میں ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ شمارہ میں اس ہمہ گیر شخصیت کا اجمالی تعارف پیش کیا جا سکے۔ اس میں ادارے کو کس حد تک کامیابی نصیب ہوئی ہے، اس کا فیصلہ قارئین کو کرنا ہے۔ اس کے متعلق اپنی رائے کے اظہار میں وہ بخل سے کام نہیں لیں گے۔ اس کی مجھے اُمید ہی نہیں بلکہ یقین بھی ہے۔

مہندر سنگھ بجاج
مدیر

آئینہ

نام : دھرم پال مرواہا

قلمی نام : جگر جالندھری

ولدیت : شری دیس راج مرواہا

جائے ولادت : سارنگدیو۔ تحصیل اجنالہ۔ ضلع امرتسر

تاریخِ ولادت : ۱۸؍ جنوری ۱۹۳۵ء

تعلیم : بی۔اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ادیب فاضل

پیشہ : ڈپٹی سیکرٹری پنجاب راج بجلی بورڈ۔ پٹیالہ

انعامات : (۱) یو۔ پی۔ اردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۰ء

(۲) محکمہ السنہ پنجاب کی جانب سے "لختِ جگر" پہ بہترین شعری تخلیق ایوارڈ ۱۹۸۱ء

(۳) یو۔پی اُردو اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۵ء

(۴) آل انڈیا میر اکادمی ایوارڈ ۱۹۸۵ء

(۵) ساحر لدھیانوی ایوارڈ ۱۹۸۶ء

(۶) راشٹرپتی کی جانب سے راشٹرپتی بھون نئی دِلّی میں اعزاز ۱۹۸۷ء

(۷) پنجاب سرکار کا پرمان پتر ۱۹۹۱ء

(۸) پنجاب سرکار کا شرومنی ساہتیہ کار (اُردو) ایوارڈ ۱۹۹۱ء

تخلیقات:

(۱) سوزِ جگر ۱۹۷۲ء

(۲) لختِ جگر ۱۹۷۹ء

(۳) خونِ جگر ۱۹۸۴ء

(۴) اندازِ جگر / دیوناگری ۱۹۸۷ء

(۵) اندازِ جگر (گورمکھی لپّی بھاشا وبھاگ پنجاب کی طرف سے زیرِ اشاعت)

(۶) دردِ جگر ۱۹۹۰ء

(۷) گل وخار / (دیوناگری) ۱۹۹۴ء

ارشادات

تاثرات

مقالات

دُعائیہ

الوالفصاحت پدم شری

قبلہ جوش ملسیانی (مرحوم و مغفور)

عزیزی جگر جالندھری کو میں ایک مدت سے جاننے کی طرح جانتا ہوں۔ وہ اگرچہ میرے قابلِ شاگرد ستر صاحب سیال کوٹی سے کامیاب تربیت حاصل کرتے رہے ہیں مگر مجھ سے بھی مستفید ہوتے رہے ہیں اور ادبی مشورے بھی حاصل کرتے رہے ہیں۔ زبان اور فن کی تحقیق کے شیدائی اور حسنِ سخن کے فدائی ہیں۔ طبیعت شاعری کے لیے بہت موزوں ہے۔ اُن کی صحیح قسم کی موزونیِ طبع پیچیدہ بحروں میں بھی صحیح کہنے پر قادر ہے۔ ایک دفعہ میں نے اپنے بیس ۲۰ بائیس ۲۲ عزیزوں کو پیچیدہ سا مصرع طرح موزونیِ طبع کا امتحان لینے کے لیے اُس طرح میں غزل کہنے کی فرمایش کی تھی نصف تعداد لڑھک گئی تھی۔ جو عزیز کامیاب رہے اُن میں جگر صاحب بھی شامل تھے۔

وہ تخیل اور زبان کو دوش بدوش رکھ کر شعر کہتے ہیں نتائجِ افکار میں جھول بہت کم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سوچ سمجھ کر کہتے ہیں۔ متروکاتِ شعری اور متروکاتِ زبان کا پورا لحاظ رکھتے ہیں۔ بندش کے لحاظ سے شعر ٹھوس اور مضبوط ہوتا ہے۔ اصلاح کی گنجایش بہت کم ہوتی ہے۔ طبیعت زیادہ تر غزل ہی کا میدان پسند کرتی ہے۔ ہر قسم کی عریانی اور بازاری زبان سے بچ کر شعر کہتے ہیں۔ خوش بیانی اُن کی طبع سلیم کا جوہر ہے۔ جوہرِ قابل کہے جانے کے مستحق ہیں۔

جگرؔ جالندھری

سحرالبیان جناب ساحر سیالکوٹی

شری جگرؔ جالندھری میرے اُن عزیزوں میں سرِ فہرست ہیں۔ جن کو میں فارغ الاصلاح قرار دے چکا ہوں۔ اسے جذبۂ عقیدت سمجھیے یا تحصیلِ علم کا شوق۔ کہ باوجود فارغ الاصلاح دیئے جانے کے وہ مجھے اپنا ہر تازہ کلام بغرضِ اصلاح دکھاتے ہیں۔ گویا اس بات کی نہایت سختی سے پابندی کرتے ہیں کہ

ع "جائے اُستاد خالیست"

اور اس میں شک نہیں کہ ایسی عقیدت سے نقصان نہیں فایدہ ہی ہوتا ہے شعر و شاعری میں پختگی اور اثر بڑی طویل محنت سے پیدا ہوتے ہیں۔ امیرؔ مینائیؒ فرماتے ہیں ؎

جب میں جوان تھا تو مری شاعری تھی پیر
اب شاعری جواں ہے تو میں پیر ہو گیا

یعنی شاعری کو جواں بناتے بناتے آدمی خود بوڑھا ہو جاتا ہے۔ لیکن جگرؔ وہ خوش قسمت نوجوان ہے جس نے پختگی کی منزل اپنی جوانی کے عالم ہی میں طے کر لی تھی اور اب اس کا شمار پنجاب کے صفِ اوّل کے شعراء میں ہوتا ہے۔ شاعری کے فن۔ اُسکی زبان اور حُسنِ تبیع سے اُسے مکمل واقفیت ہے۔ تخیّل کی بلندی ہی اچھے شعر کا معیار نہیں یعنی کیا کہا" ہی نہیں

"کیسے کہا" بھی لازمی چیز ہے۔ جس کے بغیر شعر میں شعریت پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔
قبلہ جوش ملسیانی فرماتے ہیں:

مقدم جانتے ہو جوش! اِک تم حُسنِ معنی کو
مگر ہم دیکھتے ہیں شعر میں حُسنِ بیاں پہلے

یعنی حُسنِ معنی ہی سے شعر بلند پایہ نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ حُسنِ بیان کی بھی لازمی شرط ہے۔
غالب کا یہ تخیل اور اندازِ بیاں لاجواب ہے کہ

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے مُنہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

غالب کے اِس شعر کے بعد اِس قافیہ پر سوچنے کی جُرأت نہیں ہو سکتی۔ مگر دیکھیے یہ سب کچھ جانتے ہُوئے مرزا داغ دہلوی نے اپنے حُسنِ بیان کے ہی زور سے یہ قافیہ کس کامیابی سے باندھا ہے۔ فرماتے ہیں:

وہ عیادت کو مری آئے ہیں لو اور سُنو
آج ہی خوبیٔ تقدیر سے حال اچھا ہے

غالب غالب ہی سہی مگر داغ دہلوی کے اِس شعر کی داد نہ دینا بھی مذاقِ سُخن کی توہین ہے۔ مطلب یہ کہ صرف خیالات ہی شاعری کے لیے ضروری اور اہم چیز نہیں اس کے ساتھ ساتھ حُسنِ بیاں بھی شعر کی تکمیل کے لیے اتنا ہی لازمی ہے۔ جگر ان سب باتوں کو جانتا ہے۔ اور شعر کہنے میں ان کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے کلام میں تمام محاسنِ سُخن واضح طور پر رُونما ہوتے ہیں۔

"اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

●

ڈاکٹر وزیر آغا

سرگودھا (پاکستان)

جگر جالندھری

جگر جالندھری ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ اُن کے ہاں کلاسیکی رچاؤ شعر کی ہیئت اور مواد دونوں سے مترشح ہے۔ بادہ و ساغر سے اُنہوں نے مشاہدۂ حق کی راہ بھی نکالی ہے جس طرح ہمارے متقدمین نے نکالی تھی۔ اُن کا شعری اسلوب پختہ ہے۔ مگر تازہ کاری سے محروم نہیں ہے۔ جگر جالندھری اُردو کے تہذیبی دھاگوں کو اپنے اشعار کی بُنت میں استعمال کرنے پر قادر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں قادرالکلامی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ میری دُعا ہے کہ وہ اسی جذبۂ دروں کے ساتھ اُردو شاعری کی آبیاری کرتے چلے جائیں۔

خُمار بارہ بنکوی

جنابِ جگر جالندھری

جناب جگر جالندھری اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں اُسے محسوس بھی کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار قاری یا سامع کے دل پر فوراً اثر کرتے ہیں اور اُن کا مفہوم ذہن میں اپنے آپ محفوظ ہو جاتا ہے۔

بُنیادی طور پر موصوف قدیم رنگِ تغزّل کے دلدادہ ہیں۔ مگر ادب اور وقت کے جدید تقاضوں سے گریز بھی نہیں فرماتے۔ اُن کے کلام میں قدیم و جدید رنگِ سُخن کا بیحد حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ جو قابلِ داد ہے۔

مجھے یقینِ کامل ہے کہ جگر صاحب کا کلام بلاغت نظام ادبی حلقوں میں پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جائے گا اور اُس کی خاطر خواہ ستائش کی جائے گی۔ جس کا مستحق وہ ہر لحاظ سے ہے۔

چونکہ حضرتِ جگر جالندھری کی ہستی دنیائے ادب میں اب کسی تعارف کی محتاج نہیں اِس لیے میں اِس سلسلے میں مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اُن کا فنِ لطیف خود ہی اپنی منہ بولتی تصویر ہے اور ہر قسم کی تشریح و توضیح سے بے نیاز۔

ڈاکٹر بشیر بدر

محبّت کے شاعر

جگّر جالندھری محبت کے شاعر ہیں، وہ آج کی تمام مکروہات و ذنب
سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ انسان محبّت سے مُنہ نہ موڑ لے۔ محبّت
اور اس کے دبے ہوئے غم، حُسن اور اس کے ناز و انداز آج بھی زندگی کو خوبصورت
بناتے ہیں۔ جگّر جالندھری ان تمام عروضی اور علم محاسن و معائب شعری کے علم بردا
اساتذہ سے بھی بڑھے چڑھے ہیں۔ کہ غزل کی تمام معنوی خوبیوں کو اپنے کلام میں سم
اور بے راہ روی سے دامن بچا کر ایسے اچھے شعر کہتے ہیں کہ ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں
پسند آسکیں۔

افسانہ نگار رام لعل نے اُن کے سخن کی تعریف کیا کی ہے کوزے میں دریا کو
کیا ہے فرماتے ہیں: اردو شاعری کو انہوں (جگّر جالندھری) نے ایک آفاقیت عطا کر
کا قابلِ قدر کام کیا ہے۔ انہوں نے اپنے افکار میں تخیلی تفکّر، نظریاتی میلان اور عص
حسیّت کی بھی آمیزش کر کے اس میں نئی نئی جہتیں پیدا کی ہیں۔ میری آرزو ہے
رام لعل کے اس قول پر شمس الرحمٰن فاروقی بھی اپنے دستخط کریں۔

جگر کون؟

(آنجہانی سحابِ سخن مولانا ابر احسنی گنوری)

آیئے میں بتاؤں جگر کون ہے کیونکہ میں جگر کو اتنا ہی جانتا ہوں جتنا جگر خود کو جانتے ہوں گے۔ اور ممکن ہے وہ خود کو اتنا نہ جانتے ہوں جتنا میں جانتا ہوں کیونکہ شراب کو اپنا نشہ اور شیر کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یہ تو وہی جان سکتے ہیں جن کا ان سے پالا پڑے۔ مجھے جگر سے بہت پالا پڑا ہے۔ میں نے انہیں خوب پرکھا ہے کہ وہ کتنے پانی میں ہیں۔

یوں تک بندیاں تو سبھی کر لیتے ہیں۔ مگر شعر کے مزاج کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ انمل بے جوڑ الفاظ وزن کے اندر جمع کرنا کوئی مشکل نہیں۔ مگر کون سا لفظ کہاں فٹ ہوگا کس مقام پر وہ نگینہ بن جائے گا اور کہاں خذف ریزہ یہ اس دیدہ ور کا کام ہے جس کو الفاظ کی قدر و قیمت معلوم ہو۔ اسی لئے تو شاعر کو مرصع ساز کہا جاتا ہے۔ جگر شعر کے مزاج کو بھی ایک طبیبِ حاذق کی طرح جانتے ہیں۔ اور انہیں الفاظ کے استعمالِ بر محل کا بھی عرفان ہے۔

آج کل کے مطلق العنان شاعر "کیا کہا" کو کمالِ سخن وری جانتے ہیں۔ انہیں "کیسے کہا" سے واسطہ نہیں ہوتا۔ اور واسطہ ہو بھی کیسے "کیسے کہا" گھر بیٹھے

نہیں آتا۔ اس کے لیے کسی باکمال شاعر سے مدت مدید تک سیکھنا پڑتا ہے۔
گفتگو ایک گنوار بھی کر لیتا ہے۔ لیکن وہی بات جو گنوار نے کہی کوئی مہذب اور پڑھا
کہتا ہے تو زمین آسمان کا فرق محسوس ہونے لگتا ہے۔ گنوار کی بات گنوار کے ہی
دل پر اثر کر سکتی ہے۔ باکمال سخن ور کہے تو اس کی بات سن کر انگڑائیاں آنے
لگتی ہیں۔ لیکن یہی بات جب زبان کے رموز و نکات جاننے کے واسطے گفتگو کا محل
پہچاننے والے کرتے ہیں تو پتھر پانی ہو جاتے ہیں۔ بات دل پر ایسے بیٹھتی ہے جیسے نشانہ پر تیر
اب آپ جگر کا کلام پڑھیں گے ہی۔ سچ کہیے میں نے کچھ جھوٹ تو نہیں لکھا۔ آپ کیف
میں ڈوب گئے یا نہیں۔ آپ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے یا نہیں۔ جگر کے شعر آپ کو اپنی
کہانی معلوم ہوئے یا نہیں۔ یہی کمال ہے اس جگہ میں۔ اور آپ جانتے ہیں ایسا کیوں
ہے؟ جگر کے اشعار میں اتنی صفائی اتنی کاریگری اتنی بے باکی اور اتنی تاثیر کیوں ہے؟
بات یہ ہے کہ جگر عصر حاضر کے خوب پسند شعراء میں نہیں زیادہ ہم چوں دیگرے نیست
کے لیے ہنگام نعرے لگانے والوں میں نہیں ہیں۔ انہوں نے شعر کہنے پر محنت کی ہے انہوں
نے اس فن کو ایک بڑے فن کار سے سیکھا ہے۔ جو فن کار ہی نہیں جادوگر بھی ہے۔ یعنی معروف
شاعر مشہور فن دان مقبول سخنور ساقی سیال کوٹی سے جس کو شعر کی نبضیں
دیکھنی آتی ہیں۔ بال کی کھال نکالنی آتی ہے۔ بات بات پہ فن پیش نظر رہتا ہے۔
محاسن کلام اور محاسن کلام پہ گویا اس کی حکومت ہے۔ ایسا شفیق باکمال ہنرمند
جب جگر کو مل جائے تو جگر بلند پایہ شاعر ماہر اور نباض فن نہ بنے تو کیا بنے۔
اردو کی ایک معیاری تہذیب ہے ادب و احترام سے بات کرنا چھوٹوں سے شفقت
بڑوں کی عزت برابر والوں سے محبت تہذیب سے بات کرنا۔ تہذیب نشست و برخاست
وغیرہ وغیرہ۔ یہ بات کم و بیش ہر اردو داں بالعموم اور ہر شاعر اعلیٰ قدر معیار ہمہ وقت

سامنے رکھتا ہے۔ یہ تہذیب آپ دوسری زبانوں کے شاعروں میں نہ پائیں گے۔ جگر
اس پوری تہذیب کے مجسّمہ بن کر رہ گئے ہیں۔ بات کریں گے تو منہ سے پھول جھڑ جائیں گے۔
کسی سے ملیں گے تو پیکرِ خلوص و محبت نظر آئیں گے۔ بڑوں کے سامنے نہایت مؤدب
ہو کر بیٹھیں گے۔ کسی پہلو سے دیکھ لیجیے جگر دل میں اُترتے نظر آئیں گے کسی وقت پرکھ
لیجیے وہ اصلی ہی دکھائی دیں گے۔ ان کی کسی ادا کو آپ مصنوعی اور نقلی نہیں کہہ سکتے اور یہ
باتیں آتی ہیں اس شاعر کو جس نے اُردو شعر کی تہذیب کو اپنی تہذیب بنا لیا ہو۔ جس نے
اُردو شاعری کے سمندر میں خود کو ڈبو دیا ہو۔ اور اُس کی گہرائیوں میں اُتر گیا ہو۔

ظاہر میں جگر آپ کو سیدھے سادے مگر شگفتہ پھول نظر آئیں گے۔ لیکن ذرا چھیڑ کر
دیکھیے شاعری کے کسی حسن کی بابت قبح کی بابت زبان و بیان کی بابت معائب و محاسن کلام
کی بابت تو معلوم ہوگا یہ سیدھا سادہ شخص ایک طوفانِ بیکراں ہے۔ سب کچھ جانتا ہے۔
کسی شعبۂ شعر سے بے خبر نہیں ہے۔

یوں تو جگر سے اکثر گھنٹوں صحبت رہی ہے۔ علمی، ادبی گفتگو معائب و محاسنِ کلام
پر اظہارِ خیال اور پرسش کا سلسلہ ہمیشہ ہی جب ہم ملتے ہیں شروع ہو جاتا ہے مگر
ایک پنجاب کے کسی مشاعرہ میں جگر میرے ہم سفر ہو گئے۔ اور جگر نے سوالات کا سلسلہ
شروع کر دیا۔ عجب باریک مخصوص سوال اور لطف یہ کہ جب تک جواب سے مطمئن
نہ ہو جائیں پیچھا نہ چھوڑیں۔ کئی گھنٹے کا سفر اور سفر سے واپسی اسی ماحول میں ہوئی۔ اور
اس روز میں نے سمجھا کہ جگر کو حصولِ معلومات کا کتنا بے پناہ شوق ہے۔ اور اسی لیے
میں نے لکھا کہ میں جگر کو جاننے کی طرح جانتا ہوں۔ میرے اس بیان سے یہ نہ سمجھ لیجیے کہ
جگر ہر کسی سے کوئی بات پوچھنا گوارا کریں گے۔ یہ بات نہیں وہ خوددار بھی ہیں۔ یہ بھی
جانتے ہیں کہ جب ہمیں اپنے گھر سے سب کچھ مل سکتا ہے تو ہم کسی کے آگے ہاتھ پھیلا کر

کیوں اپنا پلہ ہلکا کریں۔ میری بات الگ ہے میں جگر کے ہی گھرانے کا ایک فرد ہوں۔ برادرِ عزیز ساحر سیالکوٹی کو میں جتنا اپنے قریب پاتا ہوں اس سے جگر واقف ہیں۔ پھر وہ موقع ہاتھ آنے پر مجھے کیوں بخشیں۔

ہر شخص کی ذہانت۔ مذاق۔ شوق جداگانہ ہوتا ہے۔ چار شاعر ایک ساتھ شعر گوئی شروع کرتے ہیں۔ ایک ان میں سب سے آگے بہت جلد نکل جاتا ہے۔ ایک برسوں سر مارتا ہے مگر کچھوے کی چال سے زیادہ اس کی رفتار نہیں بڑھتی۔ وہ درمیانی منزلوں میں رہ جاتے ہیں۔ مجھے اندازہ بھی ہے اور علم بھی کہ جگر ان میں ہیں جو میدان میں سرپٹ دوڑ کر برسوں کا راستہ ہفتوں میں طے کر کے منزل مار لیتے ہیں۔ ورنہ جس عمر میں جگر آج ہیں اس عمر کے شاعر کی تو زبان کی موچ بھی نہیں نکل پاتی۔ صاحبِ نظر ہو جانا تو دور کی بات ہے۔ آیئے جگر کے کچھ شعر بھی سن لیجیے۔ ؎

بڑھے کو بشر چاند سے بھی آگے بڑھا ہے
یہ دیکھیے کردار بڑھا ہے کہ گھٹا ہے

عصرِ حاضر کے انسان کا طنزیہ بھرپور جائزہ ؎

حسرتوں کا ہو گیا ہے اِس قدر دِل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

کیا داد دی جائے اس بالغ نظری اور نازک بیانی کی۔ جس کو واقعہ بنا دیا ہے۔ مبالغہ کا کتنا حسین پہلو اجاگر کیا ہے ؎

یوں پڑا ہوں اُس آستانے پر
جیسے پتھّر ہو آستانے کا

فرائضِ عشق اور احترام وطلبِ حسن کی انتہا وضع داری کا حسین اشارہ کہ

جیسے پتھر اُٹھ کر آستانے سے نہیں جاتا مجھے بھی جانا نہیں ؎

محشر میں یہی اپنی پڑی تھی ہر ایک کو
میں اس تلاش میں تھا کہ وہ نازنیں ملے

عشق کامل نام ہی اس کا ہے کہ اپنی مصیبت کی پرواہ نہ ہو اور محبوب کی دُھن لگی ہو خواہ وہ محشر ہی کی مصیبت کیوں نہ ہو ؎

جُھکتے ہیں آدمی ہی کے قدموں پر آدمی
پھر بھی یہ لوگ کہتے ہیں بندہ خُدا نہیں

یہ اُن کے مُنہ پر جُوتا رسید کیا ہے جو خُدا کا کام بندوں سے لے کر اُنہیں خُدا کا مقام دیتے ہیں ؎

سانس آئے زندگی ہے نہ آئے تو موت ہے
موت اور زندگی میں کوئی فاصلہ نہیں

جو لوگ موت کو خُود سے دُور سمجھ کر زندگی کو مستقل سمجھ کر انسانی فرض ادا نہیں کرتے وہ غور سے اس شعر کو پڑھیں ؎

غُنچہ ہے دِل گرفتہ تو گُل دِل فگار ہے
کیوں کر کہوں کہ باغ میں جشنِ بہار ہے

غُنچہ کی دِل گرفتگی اور پھُول کی دِل فگاری کو کوئی باریک بیں شاعر ہی نظم کر سکتا ہے۔

پھر اس اشارے میں وطن کی حالت پر کتنا بہتر تبصرہ کیا ہے۔ ؎

لُطفِ ہستی مجھے کیا خاک میسّر ہوتا
آخری سانس ہر اک سانس کو سمجھا میں نے

زِندگی کی رنگینیوں میں وہی ڈوب سکتے ہیں جو زندگی کو دائمی سمجھ لیں۔ وہ کیا لُطف اُٹھائے

جو ہر سانس کو آخری سمجھے۔ ؎

پاؤں پھیلانے ہیں دنیا میں تو یہ بھی سوچ لے
ہاتھ پھیلانے پڑیں گے پاؤں پھیلانے کے بعد

شعر کمالِ شاعری کا مرقع ہے۔ دو لفظوں سے شعر بنایا اور معنویت کا خزانہ بھر دیا۔ پاؤں پھیلانے معنی ہیں دُنیا کی رنگینیوں میں محو ہو جانا۔ سامانِ عشرت جمع کرنا۔ عیش و عیاشی پر بے دریغ صرف کرنا۔ جس کا نتیجہ بھیک مانگنا یا قرض مانگنا ہے۔ اور یہی ہاتھ پھیلانے کے معنی ہیں۔ زبان کا کمال اور فضول خرچ دُنیا پرستوں کو سبق۔

یہ بطور نمونہ چند شعر پیش کر دیئے ہیں۔ ورنہ ان کے مجموعہ ہائے کلام میں آپ کو سب ایک سے ایک بہتر شعر ملیں گے۔ مختلف مضمون کے متعلق مختلف تجربات ہیں۔ سبق آموز بھی اور غم سوز بھی۔

مَیں خُدا سے دُعا کرتا ہوں کہ جگؔر کا کلام قبول عام و خاص کی سند حاصل کرے۔ ہمیں جگؔر سے بڑی توقعات ہیں۔ اچھّا۔ خُدا حافظ۔

اثر احسن گنوری

امر چند قیس جالندھری

ایک مقبول و نامور شاعر
جگر جالندھری

جگر جالندھری صاحب کا نام ہے ــــ دھرم پال ــــ مختلف قسم کے کھتریوں کی ذاتوں میں ایک ممتاز گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو "مرواہا" کے طور پر مشہور ہے۔ ان کے بزرگ ضلع امرتسر کے ایک گاؤں کے باشندے تھے۔ جس کا نام سارنگ دیو ہے۔ یہ اس سرحد پر آباد ہے۔ جو پاکستان کے نزدیک ہے۔ تقسیم وطن پر جگر کے والدِ محترم لالہ دیس راج مرواہا دوسرے لوگوں کے ساتھ ہجرت کر کے جالندھر میں مقیم ہو گئے اور اُن کے ساتھی پنجاب کے اضلاع میں پناہ گزین ہو گئے۔

جناب جگر نے ڈگری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد جہاں قانون کا امتحان پاس کیا۔ وہاں اُردو میں ادیبِ فاضل کی سند بھی حاصل کی اور اب وہ پنجاب بجلی بورڈ پٹیالہ کے محکمے میں ملازم ہیں۔ نیک نیتی سے خدمات سرانجام دیتے ہوئے ایک اعلیٰ افسر کے عہدے پر متعین ہیں۔

جگر صاحب مجھے معاف فرمائیں۔ اگر میں یہ ظاہر کرنے کی گستاخانہ جرأت کروں کہ وہ ایک ایسے انسان ہیں۔ جنہیں خوش گفتار، خوش خلق، خوش مزاج، خوش پوش اور

خوش رُو کہا جا سکتا ہے۔ وہ بڑے درجے کے شریف آدمی ہیں۔ جو بزرگوں کا احترام کرتے ہیں اور ان کا لحاظ جو عمر میں اُن سے چھوٹے ہیں۔ ایک مرنجاں مرنج بشر، محبّت کے پیکر اور وفا پرست جنہیں سماج عزت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ جن کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے۔

اب میں جگر جالندھری کے سحرِ جلال پہ ذرا سی روشنی ڈالوں گا۔ قاریئن خود بھی مطالعہ کریں گے تو اُن کی شاعرانہ عظمت کے قایل ہو جایئں گے۔

شاعری کے ابتدائی دور میں جگر صاحب نے غزلیں داغ دہلوی کے آخری جانشین ابو الفصاحت پنڈت لبھو رام جوش ملسیانی کو دکھایئں۔ جنہوں نے اُنہیں پسند فرمایا۔ لیکن پیرانہ سالی کی وجہ سے جگر کو اپنے ایک سرکردہ شاگرد ساحر سیالکوٹی صاحب کے سپرد کر دیا۔ جن کی رہنمائی میں وہ مسلسل مطالعہ اور فکرِ سخن جاری رکھے ہوئے فارغ الاصلاح قرار دیے گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اب وہ پنجاب کے نوجوان شعرا کے خاص رہنما ہیں۔

مجموعی طور پر جگر جالندھری کا کلام نہایت بلند پایہ ہوتا ہے۔ جس کی زبان پاکیزہ خیالات کے مطابق ہوتی ہے۔ ہر شعر فصاحت و بلاغت کا آئینہ۔ بازاری پن، رکاکت اور عمومیت سے پاک۔ سنجیدگی سے مالامال۔ جدید تقاضوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے وہ روایت اور قدامت کی بنیادی اقدار کو نظر انداز نہیں کرتے۔ چناں چہ اُنہوں نے خوبیوں کی بدولت اپنا ایک معتبر مقام پیدا کر لیا ہے۔ صنعتِ کاتت کا استعمال شاذ و نادر ہی کرتے ہیں لفظ ہو یا بحر۔ ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کے قایل ہیں۔ کلام کے مطالعے سے قاری محسوس کرتا ہے کہ وہ جوش، جدّت اور سادگی کا حامل ہے۔ جس میں کسی قسم کی اُلجھن نہیں ہوتی۔ وہ روحانیت اور رومانیت کے یکساں طور پر دلدادہ ہیں۔

اس وقت تک جگر جالندھری کی چھ کتابیں شایع ہو چکی ہیں جنہیں حکومت کے علاوہ ادبی انجمنوں اور ادب پرستوں نے خوب سراہا ہے۔ اُنہیں انعامات اور تمغہ جات عطا

دیکھیے ہیں۔

(۱) "سوزِ جگر" ــــ غزلوں اور قطعوں پر مشتمل ہے۔ (۱۹۷۲ء)

(۲) "تحتِ جگر" ــــ غزلیں، نظموں اور قطعوں کے علاوہ اس میں متفرق اشعار بھی ہیں۔ (۱۹۷۹ء)

(۳) "خونِ جگر" ــــ غزلوں کے علاوہ جرعات، نیز منتخب اور متفرق اشعار (۱۹۸۴ء)

(۴) "اندازِ جگر" ــــ غزلیات۔ ہندی لپی میں۔ (۱۹۸۷ء) بھاشا وبھاگ پنجاب، پٹیالہ اب اسے گورمکھی لپی میں شایع کر رہا ہے۔

(۵) "دردِ جگر" ــــ غزلیں، نظمیں، قطعات اور متفرق اشعار (۱۹۹۰ء)

(۶) اب ان کا مجموعہ ــــ "گل وخار" کے نام سے منظرِ عام پر آیا ہے۔

لگے ہاتھوں "گل وخار" ہی کے دو تین قطعے ملاحظہ فرمائیں۔ پھر باقی کتابوں سے چند اشعار قارئین کی تفریح طبع کے لیے پیش کیے جائیں گے۔ ان میں جہاں خوشی وتفنن کا سامان ملتا ہے۔ وہاں زندگی کے اہم مسایل کا یہ حل بھی پیش کرتے ہیں۔

ایک اصل قطعہ ملاحظہ ہو۔ جس میں "مطلع" نہیں ہوتا۔

سیرتِ نیک:

مٹ کے بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے
نیک انسان، نیک سیرت کو
مسلے جانے کے باوجود گلاب
ترک کرتا نہیں ہے نکہت کو

جو انسان نیک سیرت ہو۔ وہی انسان کہلانے کا مستحق ہے۔ تشبیہہ نے قطعے کی شان دوبالا کردی ہے۔ ایک اور اصل قطعہ دیکھیے:

کانٹے: بُری سے بُری چیز بھی کوئی نہ کوئی خُوبی رکھتی ہے۔ اس حقیقت کی مثال میں کانٹوں کے مضمون کا انتخاب غور طلب ہے۔ داد طلب بھی:

لاکھ کہنے کو ہیں بُرے کانٹے
سوچیے تو کمال کرتے ہیں
عُمر بھر تیرے کے محافظوں میں
پھولوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں

یہ قطعہ بھی سُنیے۔ سر دُھنیے:

پنجاب:

ہے فرشتے سے سوا ہر نوجواں پنجاب کا!
حُور سے بڑھ کر ہے اِک اِک نازنیں پنجاب کی!
اِس کے ہر اِک ذرّے میں ہے چاند تاروں کی چمک!
آسماں سے کم نہیں ہے سرزمیں پنجاب کی!

اور اب آخری قطعہ:

بین الاقوامی یک جہتی:

کانپ اُٹھتی ہے رُوح میری۔ جگرؔ!
جب کسی کا مکان جلتا ہے
میں سمجھتا ہُوں۔ اُس کے شعلوں میں
میرا ہندوستان جلتا ہے!

کئی اور تشکیل کے بھی قطعے ہیں۔ جو الگ مقالے کے مستحق ہیں۔ اس لیے اُن کی مثالیں نہیں دُوں گا۔

جگر جالندھری کی باقی کتب سے اب چند اشعار لکھے جائیں گے۔ جن سے اُن کی انفرادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ سادہ سے مضمون میں بھی اپنے اندازِ بیان سے وہ جان ڈال دیتے ہیں۔

جگر کی تخلیقات ہندوستان کے متعدد رسایل و جرائد میں احترام کے ساتھ شایع ہوتی ہیں۔ اُن کا کلام آل انڈیا ریڈیو اور دُوردرشن کیندر سے بھی براڈ کاسٹ اور ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ وہ آل انڈیا مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں اور محفل پر چھا جاتے ہیں۔ سخن کی رفعت اور پیشکش کی ادا لائقِ تحسین ہوتی ہے۔ وہ مشاعرہ لُوٹ لیتے ہیں۔ فطری طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن ان کے رنگِ تغزّل کی جھلک دُوسری اصنافِ سخن میں بھی اُسی کامیابی کے ساتھ نمایاں ہوتی ہیں۔ ان میں بھی وہ اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر اُسی حُسن و خُوبی سے دکھاتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ہر کتاب سے کلام کا نمونہ مختصر طور پر درج کیا جائے گا۔ لیجیے پہلے "دردِ جگر":

ایک "فرد" ہے ــــ یعنی وہ شعر جو کسی زمین میں ایک ہی کہا جائے۔ ؎

اُن کی بس ایک چشمِ عنایت کے واسطے
ہم نے دیئے ہزاروں محبّت کے واسطے

ردیف کا آخری ٹکڑا "واسطے" دیکھیے نگینہ جڑ دیا گیا ہے۔ دونوں جگہ معنی مختلف ہیں۔ جو شاعرانہ کمال کی دلیل ہے۔ ایک مرصّع "فرد" دیکھیے۔ ؎

مُسکراتا ہے تو ستا کے مجھے
میں ستاؤں گا مُسکرا کے تجھے

دونوں مصرعوں میں الفاظ کی تعداد یکساں ہے۔ "ردیف" ہے "کے"۔ جو دو دو مختلف قوافی کے درمیان صنعتِ عکس۔ ایسی ردیف کو "ردیفِ حاجب" کہتے ہیں۔ یہ بھی جگر صاحب

کی عروض دانی کا ثبوت ہے۔ جو ایک کرشمے سے کم نہیں۔ ایک اور "فرد" دیکھیے۔ ؎

ارمان محل ہو گیا مسمار کسی کا
بھونچال سے کچھ کم نہ تھا انکار کسی کا

"کسی" "محبوب اور عاشق" دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تکرار داد سے مستثنیٰ ہے۔ جگر صاحب اگر یہ تینوں "فرد" ہی لکھتے تو ان کا نام ہمیشہ زندہ رہتا۔ کیا کہنے اس طرز بیان کے۔ اب دو ایک اور اشعار سنیے۔ پھر دوسری کتابوں کی طرف توجہ مرکوز ہوگی۔

ایک سلیس شعر ہے، "عطف و اضافت" کے بغیر۔ ندرت خیال اور نزاکت بیان کی واقعیت کو مبالغے کی خوبی نے اجاگر کر دیا ہے۔ ؎

حسرتوں کا ہو گیا ہے اس قدر دل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

"انگڑائی" پر بہت سے مضامین قارئین کی نظروں سے گزر چکے ہیں۔ جگر کا یہ شعر بھی انوکھا ہے۔ پرلطف اور پرکیف، نیز پرکشش بالتصویر کشی کا کیا کہنا! ؎

دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے ہمیں
کتنی ظالم ہے تیری انگڑائی!

"ظالم" کا استعمال کس قدر خوب صورت ہے۔ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اب دو ایک اور شعر سن لیجیے:

جتنے مجبور ہو گئے ہیں ہم
اتنے مغرور ہو گئے ہیں آپ

"صنعت ترصیع" کی لاجواب مثال۔ یعنی دونوں مصرعوں کے الفاظ کی تعداد برابر۔ کوئی ترکیب نہیں۔ "سہل ممتنع"

اب آخر میں ایک تیر و نشتر۔ تشریح کی ضرورت نہیں۔ اپنی تشریح آپ ہی آپ ہے۔ حقیقت کی ترجمانی بے نظیر ہے

صاف گوئی سے کیا لیا ہم نے؟
سب کو دشمن بنا لیا ہم نے!

"مثنوی" کی چھوٹی سی بحر کو ردیف نے چار چاند لگا دیے ہیں۔ سادہ بیانی اور سلاست داد و تحسین سے بالا ہے!

چوتھا مجموعۂ کلام ہندی لپی میں منظرِ عام پر آکر مقبول ہو چکا ہے۔ اب پنجابی داں بھی جو اردو نہیں جانتے۔ اِس کا مطالعہ کر سکیں گے۔ ہندی دانوں کی طرح جو اردو سے بے بہرہ ہیں۔ دو ایک اشعار کا اندراج دِل چسپی کا باعث ہوگا ہے

ہمارا حال سُن کر وہ اگر اتنے پریشاں ہیں!
ہمارا حال دیکھیں گے تو اُن کا حال کیا ہوگا؟!

❖

پاؤں پھیلانے ہیں دُنیا میں تو یہ بھی سوچ لے ہے
ہاتھ پھیلانے پڑیں گے پاؤں پھیلانے کے بعد

❖

انجام سے آغاز کی طرف آرہا ہوں۔ آخری تین[۳] کتابوں کا ذکر ہو چکا۔ اب پہلی تین[۳] کتابوں کے متعلق عرض کرنے لگا ہوں۔

تیسری کتاب ہے۔ "خونِ جگر" "خونِ جگر" کے کلام کو بھی جگر نے خونِ جگر پلایا ہے — دو تین غزلوں کا ایک ایک شعر سُن لیجیے۔ فرماتے ہیں جگر ہے

ہے قسم "خونِ جگر" کی مجھ کو اے اُردو زباں! ٭ کم نہ ہونے دوں گا تیرے باغ کی رنگینیاں۔ "مطلع"

کتاب کے نام کے لحاظ سے "خونِ جگر" کی قسم تعریف و توصیف کی مستحق ہے۔
اور خون ملاحظہ ہو ؎

خونِ ناحق نہیں پروانوں کا دیکھا جاتا
ہم چراغوں کو سرِ شام بجھا دیتے ہیں

یہ شعر دیکھیے۔ محبوب کو ظلم و ستم کے الزام سے بچاتے ہوئے کس طرح معصوم قرار دیا گیا ہے۔ اسے کہتے ہیں شانِ عاشقی! ؎

میری فطرت بھی تو ہو سکتی ہے آزار طلب
تمہیں نے رنج دیے ہوں یہ ضروری تو نہیں

حقیقت کی ایک اور لاجواب تصویر ؎

کوئی زندگی کی تمنّا نہ کرتا
اگر اس میں ہوتا نہ عہدِ جوانی

اور کوئی طرزِ بیاں عہدِ جوانی کی اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتی ہے؟ اس دور کی دل ستانی کی ترجمانی صرف دو الفاظ ہی میں روبرو آجاتی ہے۔ ؎
"خونِ جگر" کا ایک مطلع سنیے۔ "تخلّص اگرچہ "مقطع" کا حق ہے۔ لیکن شاعر اسے "مطلع" میں بھی باندھ سکتا ہے ؎

جگر! رنگینیاں پھیلیں گی "جب" سارے زمانے میں
اگر خونِ جگر شامل کروگے تم فسانے میں

یہ خیال بھی نادر ہے ؎

یہ دل کا آئینہ اب توڑنے کے قابل ہے
دکھائی دیتا نہیں اس میں روئے یار مجھے

عربی کا مقولہ ہے۔ "اشعارنا، اولادنا" (ہمارے اشعار، ہماری اولاد ہیں)
اِس لحاظ سے دوسری کتاب کا نام "لختِ جگر" نہایت موزوں ہے۔ بیٹے کو بھی "لختِ جگر" کہتے ہیں..... اِس کتاب کے بارے میں جگر کا شعر ہے۔ ؎

تخلیق کیا میں نے اُسے اپنے لہو سے
کہتے ہیں جسے شعر۔ مرا "لختِ جگر" ہے

جگر اُن بحروں میں بھی آسانی سے غزلیں کہہ لیتے ہیں۔ جن میں عروض کی پیچیدگیاں ہوتی ہیں۔ اُن کی طبیعت کی موزونیت خداتعالیٰ کی دین ہے۔ جوش ملسیانی قبلہ بھی اس حسنِ کلام کی داد دیتے ہیں۔ بحر منسرح میں جگر کے دو ایک شعر ملاحظہ فرمایئے۔ اوزان ہیں ــ

مفتعلن فاعلات مفتعلن فع

؎ آنکھ نہیں وہ۔ جو اشکبار نہیں ہے
دِل ہی نہیں وہ۔ جو بے قرار نہیں ہے

؎ جس میں نہ گل دیدۂ نہالِ تمنّا
میری نگاہوں میں وہ بہار نہیں ہے

ایک شعر ؎

سَو سمندر بھی اُسے سیراب کر سکتے نہیں
پیاس جو اپنی بڑھاتا ہے کنارے کی طرح

تشبیہہ کی ندرت غور طلب ہے!
اِس "مقطع" میں شاعر کی سادہ لوحی دیکھیے: ؎

تم کو اُمیدِ وفا؟ وہ بھی بتوں سے؟ اے جگر!
ڈھونڈتے ہو پھول جاکر پتھروں کے شہر میں

اور اب پہلی کتاب — "سوزِ جگر"..... آپ دیکھیں گے کہ اُن کی ابتدا بھی پہلو میں کوئی انتہا لیے ہوئے ہے۔ اِس مقطع "بہ تعلّی" ملاحظہ فرمائیں۔ ؎

بلبل کو اپنی نغمہ سرائی پہ ناز ہے
مضطرب! اُسے کلامِ جگر کا سُنا کے دیکھ

ایک طرحی مشاعرے میں اُن کی غزل بہت پسند کی گئی۔ رنگِ تغزّل کی داد دیجیے۔ ؎

منہ پھیر کے محفل میں اُدھر بیٹھنے والے!
بیٹھے ہیں ترے طالبِ دیدار اِدھر بھی

میں نے حضرت جگر جالندھری کی غزل کے متعلق کچھ عرض کیا ہے۔ اُن کی مختلف اصنافِ سخن بھی غزل کی طرح محاسن سے مالا مال ہیں۔ یہ ایک علیحدہ مضمون کی متقاضی ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ میں جگر کے کلام کے ساتھ انصاف نہیں کر سکا۔ چھ سال سے ایک حادثے کے زیرِ اثر بستر تک محدود ہوں۔ اُٹھنا۔ بیٹھنا۔ چلنا پھرنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ اگر خدا نے توفیق دی تو نظمیات کے بارے میں ایک الگ مضمون سپردِ قلم کروں گا۔ ●

آدمی

پھول کتنا بھی خوبصورت ہو
اُس میں نکہت نہیں تو کچھ بھی نہیں
لاکھ جوہر ہوں آدمی میں، اگر
آدمیت نہیں تو کچھ بھی نہیں

جگر جالندھری.....

شاعرِ معجز بیاں

جگر جالندھری

ممتاز الشعراء ساحر ہوشیارپوری

(*)

جگر تخلص کی یہ فضیلت ہے کہ جس سخن گو نے بھی اِسے اختیار کیا۔ وہ مقبولیت اور شہرت کے آسمان پر آفتاب و ماہتاب بن کر درخشاں ہُوا۔ جگر بریلوی، جگر مرادآبادی، جگر گورکھپوری اور ہمارے جگر جالندھری کی مثال میرے اِس نظریے کی تصدیق کرتی ہے۔

جگر جالندھری کو موزونیِ طبع مبداءِ فیّاض سے عطا ہوئی۔ زود گوئی اور پُرگوئی کا وصف اُنکی ذاتی صلاحیتوں کا ثمرہ ہے۔ خوش فکری کا ملکہ مشقِ سخن کی دین ہے اور صفائیِ بیان و سادگیِ زبان کی شعوری کاوش جو دبستانِ داغ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اُن کے اُستادِ محترم جناب ساحر سیالکوٹی مرحوم کی تربیت و رہنمائی کی مرہونِ منت ہے۔

جگر صاحب کا کلام عیوب سے پاک اور شعری محاسن کا ایک پیکرِ جمیل ہے۔ جو قاری کے ذہن و دل کو فرحت اور رُوح کو بالیدگی سے ہمکنار کرتا ہے نظم، غزل اور قطعات پر مشتمل ان کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حکومتِ پنجاب، اُتّر پردیش اردو اکادمی اور دیگر ادبی تنظیموں نے اُن کو اعزاز و انعام سے نوازا ہے۔ اُن کا جشن بھی منایا گیا اور اُن کی ایک کتاب کی رسم رُونمائی راشٹرپتی بھون میں عزت مآب گیانی ذیل سنگھ سابق صدرِ جمہوریۂ ہند کے دستِ مُبارک سے عمل میں آئی۔ عوام و خواص میں اُن کے کلام کی پذیرائی اِس امر کی دلالت کرتی ہے کہ اُنھوں نے اپنا شعری سفر نہایت استقلال، لگن اور محنت سے طے کرنے کے بعد ہی یہ مقامِ بلند حاصل کیا ہے۔ اور فنِ شعر کے رموز و نکات کو سمجھنے، پرکھنے اور سلیقے سے برتنے کی ہُنرمندی اُن کی مسلسل ریاضت ہی کا صلہ ہے۔ اُنکے اشعار میں آورد کا شائبہ تک نہیں۔

آمد ہی آمد ہے۔ کلام پڑھتے جائیے اور آفریں و مرحبا کہتے جائیے۔

جناب جگر کا نیا مجموعہ کلام "دردِ جگر" زیرِ اشاعت ہے۔ اس میں مشمولہ چند اشعار پر نظر ڈالنے ہی ہم نے یہ محسوس کیا ہے کہ وہ علم بدیع کے عمیق مطالعے سے بھی اس حد تک بہرہ ور رہے کہ صنائع لفظی و معنوی کسی شعوری کوشش کے بغیر ان کے کلام میں حُسن و خوبی کے مظاہر بن کر جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند شعر پیش ہیں: ؎

اپنی صورت دیکھ کر حُسن اتنا اِتراتا ہے کیوں؟ :: رہنے والی ایک صورت پر کوئی صورت نہیں

•

ہم سائے اب اتنا بھی گوارا نہیں کرتے :: ٹل جائے جو دیوار سے دیوار کا سایہ

دونوں شعر صنعت تجنیس اور صنعت تکرار کی اعلیٰ مثال ہیں۔ پہلے شعر میں صورت اور دوسرے شعر میں دیوار کی تکرار تصنیع و ادعا سے مستغنی ہے۔ نیز دوسرے شعر کے مصرعہ دوم میں صنعت تحتانیہ بھی اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ یعنی اس مصرعہ کے تمام نقطہ دار حروف کے نقطے نیچے واقع ہوئے ہیں۔ ؎

غیر نیچا خود بہ خود ہو جائے گا
خود کو پہلے اُس سے اونچا کیجئے

سلاست تو اس شعر کی جان ہے ہی اور اس صداقت اسکی روح۔ مزید برآں "نیچا" اور "اونچا" کے الفاظ صنعت متضاد کے حامل ہیں۔ صنعت متضاد ہی میں ایک اور شعر دیکھیے: ؎

کب وہ رکتے ہیں کسی منزل پہ شوق :: جن کو چلنے میں مزا آتا ہے؟

"رکنے" اور "چلنے" میں تضاد ظاہر ہے۔ اس شعر میں مضمون آفرینی بھی لائق تحسین و داد ہے۔ صنعت عکس کی مثالیں ملاحظہ ہوں: ؎

صاف گوئی سے کیا لیا ہم نے؟
سب کو دشمن بنالیا ہم نے؟

مُسکراتا ہے تو ستا کے مجھے
میں ستاؤں گا مُسکرا کے تجھے

سُبحان اللہ، سُبحان اللہ! ان اشعار میں صنعتِ عکس کی دل نواز خصوصیت کے ساتھ ساتھ برجستگی اور سلاست کے عناصر کارفرما ہیں۔ دوسرے شعر میں تو "خود کلامی" کے انداز نے عزم، وقار، خودداری اور عظمتِ عشق کی گویا تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ جسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

ہم نے کتنے پہاڑ کاٹے ہیں
اِک تمنا کی مورتی کے لیے

شعر کے مصرعہ ثانی میں تمام حروف کے نقطے اوپر ہیں اسے صنعتِ فوقانیہ کہتے ہیں۔

شگوفے اپنی ہستی کو مٹا کر پھول بنتے ہیں
جگر! پانے کی خاطر کچھ نہ کچھ کھونا ہی پڑتا ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں صنعتِ مراعات النظیر اور دوسرے مصرعے میں صنعتِ متضاد کا حسین استعمال ہوا ہے۔ جو خالقِ شعر کی چابکدستی اور نکتہ آرائی کا غماز ہے۔

اس مختصر سے جائزے میں جناب جگر کی غزلیہ شاعری کے چند پہلوؤں پر اظہارِ رائے کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اِدھر میری ناسازیِ صحت میں بے ربطی پیدا ہو چکی ہے۔ اور اُدھر ان کے نئے شاہکار کی اشاعت کا مسئلہ تمام ترجیحات کا متقاضی ہے لہٰذا! اُمید کرتا ہوں کہ اس پس منظر میں یہ چند سطور ہی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کا جواز متصور ہوں گی۔

کالی داس گپتا رضاؔ

لذّتِ دردِ جگر

جگرؔ جالندھری کے چار مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے تھے۔

سوزِ جگر ـــــــ سنہ ۱۹۷۳ء
لحنِ جگر ـــــــ سنہ ۱۹۷۹ء
خونِ جگر ـــــــ سنہ ۱۹۸۴ء
اندازِ جگر ـــــــ سنہ ۱۹۸۷ء (ہندی)

اور میں نے شکر ادا کیا تھا کہ یہ مختصر مضمون کا عنوان "دردِ جگر" رکھ سکوں گا مگر جگرؔ صاحب نے تڑاق سے اپنا پانچواں مجموعۂ کلام "دردِ جگر" (سنہ ۱۹۹۰ء) مرحمت فرما دیا۔ میرے لیے سوائے اس کے اور کوئی رستا نہ چھوڑا کہ میں "دردِ جگر" سے صرف لذت یاب ہوں۔ اور اب ع

"دِل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب" ہے۔

اِس بات کے اعلان کرنے کا مدعی بھی ہے کہ اسے صحیح عنوان ہاتھ آگیا۔

اردو غزل میں میرؔ اور غالبؔ کا نام مٹانے سے بھی نہیں مٹ سکتا۔ مگر یہ

جان لیجیے کہ میر کا لگ بھگ دو تہائی کلام رطب و یابس سے بھرا پڑا ہے اور باقی کا ایک تہائی کلام ہی ہے جو میر کو میر بنائے ہوئے ہے۔ غالب نے اپنے پورے کلام کا تقریباً ۶۰ فی صد اپنے ہاتھوں سے ضایع کر دیا تھا اور بقیہ چالیس فی صد (۱۸۰۲ اشعار) بھی مزید انتخاب ہو کر ہی مقبول ہوئے۔ لیکن آج غالب جس رتبے پر فائز ہے اُس سے کون واقف نہیں۔ مطلب یہ کہ کوئی شاعر خواہ وہ بڑا اور عظیم ہو ہمیشہ اچھا نہیں کہہ سکتا یا یہ کہ کسی شاعر کے سب اشعار اچھے نہیں ہوتے۔ اسی لیے اگر کسی شاعر کا ایک کڑا انتخاب بھی مشامِ جاں کو معطر کر سکے تو اُسے اچھا شاعر تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

جناب جگر جالندھری کے مجموعۂ کلام کو بھی اسی نظر سے دیکھا جائے گا۔

اُستاذی قبلہ جوش ملسیانی نے فرمایا تھا: ؎

کیا کہا یہ ہی نظر اُٹھتی ہے کیوں
دیکھنا یہ بھی تو ہے کیسا کہا

گویا حُسنِ معنی اور حُسنِ بیان دونوں کا موجود ہونا ہی شعر کو بناتا ہے اور ایسے اشعار جن میں یہ دونوں صفات موجود ہوں بہت زیادہ نہیں ہو سکتے بلکہ ایک غزل میں ایسے ایک شعر کی موجودگی بھی اِس بات کا ثبوت ہوگا کہ شاعر، شاعر کہلانے کا مستحق ہے۔ یوں بھی جگر صاحب "دردِ جگر" کی اشاعت کے وقت ۵۵ سال کے ہو گئے تھے۔ عمر میں ۵۵ سال کا پیوند لگے تو فوراً زندگی سے مستقبل قریب میں سبکدوش ہونے کا خیال آنے لگتا ہے۔ دفتری لحاظ سے یہ پہلے ہی ملازمت سے ریٹائر ہونے کا زمانہ ہو مگر گلشنِ شاعری میں یہ پھول کھلانے کا زمانہ ہوتا ہے۔ گویا شاعر کے لیے موسمِ پیری، موسمِ گُل ہے۔ اِس لیے بلاخوف کہا جا سکتا ہے کہ "دردِ جگر" ۵۵ سالہ جگر صاحب کے باطنی درد ہی کی اشاعت نہیں، قاری کے لیے "درمانِ دردِ جگر" کا محضر بھی ہے۔ لہٰذا ہمیں یہاں درد اور درمانِ درد

دونوں سے لذّت یاب ہوتا ہے۔ یاد رہے درماں، درد سے پہلے ایجاد نہیں ہو گیا تھا۔ درد جاگتے ہیں ہُوا تو اس کا درماں نکلا۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں کہ درد خُود درمانِ درد ہے۔ جگر صاحب نے وضاحت سے کہہ دیا ہے ؎

کون سمجھائے چارہ سازوں کو
درد ہے میرے درد کا درماں

٭

درد کی جب کوئی دوا ہی نہیں
کیوں نہ پھر درد کو دوا کہیے

٭

بہت زمانہ پہلے، شاید ۱۹۳۸ء کی بات ہے۔ مَیں ورنیکولر فائینل کا سرکاری امتحان دینے کے لیے بنگہ (ضلع جالندھر تحصیل نواں شہر) گیا اور لڑکے بھی ہمراہ تھے۔ جاڑوں کے دن تھے۔ ریلوے روڈ کی نکڑ پر حلوائی کی ایک دُکان ہُوا کرتی تھی۔ صُبح کے وقت وہاں چائے پینے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ ایک دن جبکہ بھیڑ کم تھی، دکان کے ایک طرف ایک فقیر بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ لیکن مَیں نے دیکھا کہ اس کے آس پاس تو کوئی ہے ہی نہیں۔ تو پھر وہ کس سے مخاطب ہے؟ اور فقیر برابر کہے جا رہا تھا کہ "بھائی ذرا اور صبر کر، تھوڑی ہی دیر ہے داتا تیری سب تکلیف دُور کر دے گا۔ صبر بھائی صبر" مَیں نے پوچھا: "بابا آپ کس سے باتیں کر رہے ہیں۔" فقیر کہنے لگا۔ "دِل سے۔ چلنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔" اتنے میں چائے آ گئی اور فقیر (پاگل فقیر) سیر ہو کر چلتا بنا۔ کیا جگر صاحب نے اس مطلع میں اُسی فقیر کے جذبات کی ترجمانی کی ہے؟ ؎

صبر کر صبر اے دلِ ناداں
جبر ہے چند روز کا مہماں

میں اسے تسلیم نہیں کرتا کہ فکرِ شعر کرتے وقت نقّاد حضرات کے گھڑے ہوئے اصولوں کو مدِّنظر رکھا جائے کیونکہ تخلیقی لذّت کو (جو حقیقت میں لذّتِ دردِ باطن ہی کا دوسرا نام ہے) نقد و نظر کی حاجت نہیں ہوتی۔ چنانچہ ایسے اشعار میں چاہے نقّاد کے لیے گہری شاعری کے اسباب موجود نہ ہوں مگر قاری کی روح کی بالیدگی کے لیے وافر سامان موجود ہے۔

اگر روپ دیکھوں، ترا روپ دیکھوں
اگر یاد آئے، تری یاد آئے

٭

کچھ تو سامان ہو اپنے جینے کا
تم نہ آؤ، تمہاری یاد آئے

٭

طوفان تو پہلے بھی کئی دیکھے ہیں دل نے
اب کے بڑا بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

٭

جی بھر کے یہ رونے بھی نہیں دیتے کسی کو
اے دیدۂ تر! تو نے ابھی غم نہیں دیکھے

٭

پیڑ کو تو کاٹ کر پچھتائے گا
پھول پھل کیا؟ سائے سے بھی جائے گا
توڑتے ہو آئینے کو کس لیے
یہ جو دیکھے گا دکھاتا جائے گا

ہوں مبارک تم کو دنیا داریاں
یہ ہنر ہم سے نہ سیکھا جائے گا

٭

زیر لب اُن کا مسکرا دینا
دل میں شہنائیاں بجا دینا

٭

بہار اپنی ہے کیا؟ اپنی خزاں کیا
تمہارا مسکرانا، روٹھ جانا

٭

تمنّا بڑی عجیب چیز ہے۔ شاعروں نے اسے الگ الگ نام دیے ہیں۔ غالب کے اس لافانی شعر میں تمنّا، افسونِ انتظار کا نام ہے۔

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنّا کہیں جسے

مگر جگرؔ صاحب نے جو معنی پہنائے ہیں وہ اس سے پہلے سننے میں نہیں آئے۔ فرماتے ہیں:

زندگی بھر نہ ہم کو چین ملا
کوئی طوفاں تھا یا تمنّا تھی

یعنی زندگی کو تمنّا کے سبب تلاطم ہی تلاطم کا سامنا رہا۔

ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ میں استاذی قبلہ جوشؔ ملسیانی مرحوم کے در دولت پر ۸۔ اپریل ۱۹۶۳ء کو حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں میں نے کچھ غیر مطبوعہ کلام کی فرمائش کر دی۔ فرمایا کہ "جارج پنجم کے انتقال (۲۱ جنوری ۱۹۳۶ء) کی خبر پہنچی تو ہمارے اسکول میں

جس میں میں معلّم تھا چھٹّی کا اعلان کر دیا گیا۔ طلباء تو خوش ہوتے ہی ٹیچر بھی خوش ہوئے۔ اتنے میں اسکول کے ہیڈ ماسٹر مسٹر ہانڈہ کا حکم آ گیا کہ ٹیچروں کو چھٹی نہیں ہو گی۔ میں نے فوراً یہ شعر کہہ کر دل کی بھڑاس نکالی ؎

"تمنّا تھی کہ گھر جا کر گریں گے جلیبی پانڈے پر
مگر افسوس صد افسوس اِس کم بخت ہانڈے پر"

یہاں تمنّا کی کے ٹکڑے سے جو حسرت اور ناکامی ٹپک رہی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

جگر صاحب دبستانِ جوش ملسیانی یعنی خاندانِ داغ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے ان کی شاعری پران کا اثر ہونا لازمی تھا۔ نتیجتاً حُسنِ بیان جگر صاحب کے یہاں بیش تر مقدّم رہتا ہے۔ کہیں کہیں اپنے ہی خاندان کے اساتذہ کے اشعار کو اپنے لفظوں میں پیش کیا ہے اور حق ادا کیا ہے جیسے ذوق کا مشہور شعر ہے۔ ؎

اُن کے گھر لے چلا مُجھے۔ دیکھو
دِلِ خانہ خراب کی باتیں

جگر صاحب کہتے ہیں ؎

عِشق تو وادیِ دِلدار ہے۔ دِل!
تو کہاں مجھ کو لیے جاتا ہے

جوش ملسیانی ؎ آدمی ہیں شمار سے باہر
قحط پھر بھی ہے آدمیّت کا

جگر صاحب اس پر اضافہ کر کے کہتے ہیں ؎

آدمی کچھ بھی نہیں ہے آدمیّت کے بغیر ٭ پھول وہ کیا پھول ہے جس پھول میں نکہت نہیں

نوحؔ ناروی مرحوم کی ایک مشہور غزل کے دو شعر دیکھیے ؎

اپنے جینے کا طور کچھ بھی نہیں
سانس چلتی ہے اور کچھ بھی نہیں

٭

زندگی دیکھنے میں سب کچھ ہے
سمجھیے جو بغور کچھ بھی نہیں

٭

جگرؔ صاحب کے یہاں دونوں اشعار کا مفہوم موجود ہے ؎

زندگی کی بنا ہے سانسوں پہ
شمع یہ جلتی ہے ہواؤں میں

٭

اے شمع زندگی! تجھے دیکھا ہے غور سے
انجام کچھ نہیں، ترا آغاز کچھ نہیں

— تاہم جگرؔ صاحب کے اشعار میں سرقے کا شائبہ تک نہیں کیونکہ ایسی مشابہت عموماً دو وجہوں سے در آتی ہے۔ اول مطالعہ جس کے دوران بعض مفاہیم ذہن کے کسی گوشے میں محفوظ ہو جاتے ہیں۔ دوم روایتی شاعری کے محدود موضوعات جن کا اعادہ بار بار ہوتا ہے۔ ایسی مثالیں کسی بھی شاعر کے کلام میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔

جگرؔ صاحب شعر کے حسن و قبح سے بخوبی واقف ہیں اگرچہ انہوں نے غزل کے علاوہ دوسری اصناف میں بھی کہا ہے مگر سچ یہی ہے کہ وہ غزل کے شاعر ہیں اور اس

صنف کے نکات کو انہوں نے چابکدستی سے برتا ہے۔ گہرے جذبات اور غزل کی اداؤں کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر انہیں مہارت حاصل ہے۔ خاموشی کی لذت لبِ گل ہی لے سکتا ہے اُسی طرح اُن کے بعض اشعار کا لُطف زبان کا مزاج داں ہی لے سکتا ہے۔ ؎

رات دِن پتھروں کی بارش ہے
ایک دل کی شکستگی کے لیے
زندگی کو نکھارتے ہیں غم
یہ اندھیرے ہیں روشنی کے لیے

٭

جانے والے یہ بات یاد رہے
ہم کو آساں نہیں بھُلا دینا
اے خدا بارشِ کرم کے ساتھ
اِک سمندر کا حوصلہ دینا

٭

یاد کی ٹیس کہاں جاتی ہے
وقت سے زخم تو بھر جاتے ہیں

٭

یہ شرف پھُول ہی کو حاصل ہے
ورنہ ہنستا ہے کون خاروں میں

٭

بنے ہیں پھول دل کے داغ کھل کر
دلِ ناکام کام آنے لگا ہے

*

آشیانے میں جذب کر ان کو
بچ کے واپس نہ بجلیاں جائیں

*

دل تڑپ کر انہیں تڑپاتا ہے
پیار میں لطف بڑا آتا ہے

*

کب وہ رکتے ہیں کسی منزل پر
جن کو چلنے میں مزا آتا ہے
میری نظروں میں سمانے والے
مجھ سے چھپ چھپ کہاں جاتا ہے
ان سے بہتر ہے تصور ان کا
جب بلاتا ہوں، چلا آتا ہے

*

جگر صاحب سیدھی سادی، واضح شاعری کرتے ہیں۔ نہ ہی ادق مضامین خود الجھتے ہیں نہ قاری کو الجھاتے ہیں۔ فلسفہ نہیں بگھارتے۔ زمین سے چپک کر آسمان کی باتیں نہیں کرتے۔ بھاری بھرکم تراکیب والفاظ سے اشعار کو بوجھل نہیں بناتے۔ وہ سوداگرِ دردِ جگر ہی سہی مگر راحتِ جاں "بیچتے" ہیں۔

پُورن سنگھ ہُنرؔ

گُفتنی

دار و رسن روایتِ اہلِ جنوں سہی
زندہ رہا ہے خُود بھی روایت کبھی کبھی

(احسان دانش)

روایت ہی کا زہر پی کر ہم نے اِسے آبِ حیات بنایا ہے۔ شاعری ہر دَور میں اور ہر ادب میں تہذیب اخلاق اور انسانیت کی علم بردار رہی ہے اور اس میں ہر رنگ موجود ہے۔ پچھلے مقتدر شعراءِ کرام ہمارے ادب کا بہترین سرمایہ ہیں — آج سائنسی ترقی نے ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے۔

اِس سائنسی ترقی نے ہمارے ادب پر بھی گہرا اثر ڈالا ہے۔ تاثرات و احساسات حسین ادبی ہیئت اور پیکر آفرینی کی جھلک خوبصورت ہو گئی ہے۔ محض حُسن و عشق کی گردان نہیں بلکہ زندگی کی شاعری اس دَور میں پائی جاتی ہے۔ فکری مضامین کو شعری حسن کے ساتھ پیش کرنے سے ارفع شاعری وجُود میں آتی ہے۔ ترنم الفاظ

سین ادبی ہیئت اور خارجی فطرت کی تصویر کشی اور داخلی تاثرات کی عکاسی کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔

مصنوعی عشق اور خیالی آداب فرضی محبوب اور اس کی خیالی صفتوں کا دور اب ختم ہو چکا ہے۔ اب سائنسی دور ہے اور نیا دور۔

شری دھرم پال مرواہا جگر جالندھری کو میں جب وہ جالندھر میں ملازمت کے سلسلہ میں تعینات تھے۔ اور اس وقت جالندھر میں مشاعروں کی بڑی دھوم دھام ہوا کرتی تھی جانتا ہوں یہ زمانہ اُن کے عنفوانِ شباب کا زمانہ تھا۔ جگر صاحب کو ہر مشاعرہ میں کلام پڑھتے ہوئے دیکھا اور جناب ساحر سیال کوٹی جو میرے ہمعصر تھے اُن کے مکان پر بھی کئی نشستوں میں سُنتا رہا۔ اُن کے پڑھنے کا انداز آج بھی وہی ہے جو چند برس پہلے تھا بڑے والہانہ اور پُر کیف انداز سے پڑھتے تھے۔

اس کے بعد وہ اپنی ملازمت کے سلسلہ میں پٹیالہ چلے گئے۔ لیکن جالندھر میں وہ اپنی ذہانت اور خوش طبعی کے چرچے چھوڑ گئے۔ وہاں جا کر بھی انہوں نے اپنی مشقِ سخن جاری رکھی۔ مگر جالندھر ہی میں وہ اپنی مشقِ سخن کے بل بوتے پر اچھے شعر کہنے لگے تھے اور جب کبھی جالندھر میں کوئی بڑا مشاعرہ ہوتا۔ تو انہیں مدعو کیا جاتا۔ وہ اپنے حُسنِ اخلاق اور حُسنِ کلام کی وجہ سے قرار واقعی شُہرت حاصل کر گئے۔

جب اُنہوں نے اپنا مجموعہ کلام شائع کیا تو اُنہیں اور بھی شُہرت حاصل ہوئی اور اس مجموعہ پر محکمہ السنہ پنجاب نے اُنہیں ایوارڈ بھی دیا۔ اور عوام میں بھی اُن کی عزت بڑھی۔

اخلاق کے لحاظ سے بھی جگر صاحب بڑے مودب ملنسار اور حفظِ مراتب کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ بہت اچھے شریف انسان ہیں۔ انسان جتنا اچھا ہوتا ہے اُتنا وہ اچھا شاعر بھی۔

پٹیالہ میں بھی اکثر مشاعروں میں اُن سے مُلاقات کا سلسلہ جاری رہا۔ بھاشا وبھاگ پٹیالہ کی تقریبوں میں بھی اُن کا کلام بلاغت نظام سُننے کا موقع ملتا رہا۔

ایک صحیح اور صالح ذوق رکھنے والا شاعر اپنے ادبی ماحول میں پنپتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے بجلی بورڈ میں بھی اپنی شُہرت کی چھاپ لگا دی۔ بورڈ خُود بھی اپنی تقریبات میں بڑے شاندار مشاعرے منعقد کرتا رہا ہے۔ جس میں مُلک کے گرانقدر شعراء کرام حِصّہ لیتے رہے ہیں۔ اور وہاں خود بھی اِنہوں نے سٹیج سیکریٹری کے فرائض انجام دیے ہیں۔

اِن کے تیسرے مجموعۂ کلام پر بھی انہیں پہلا ایوارڈ پنجاب سرکار نے دیا ہے۔ اِنکی مشقِ سخن اب اس مقام پر ہے۔ کہ وہ خُود اُستاد ہیں اور اِن کے کئی شاگرد بھی۔ اب حکُومت پنجاب نے اُنہیں شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ کے لیے چُنا ہے۔ اِس سے اُن کی علمی و ادبی انفرادیت کا اندازہ عوام بخوبی کر سکتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی بُنیاد ہی تغزّل پر ہے۔ اور ایسا شاعر اپنی انفرادیت زمانے سے منوا سکتا ہے۔ اِن کا مذاقِ شعری بھی بُلند ہے۔ بڑے ذوق سے کام لیتے ہیں۔ مشاعروں میں داد حاصل کرنا ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں۔ کیونکہ یہ پڑھتے نیچرل طریقے سے ہیں۔ اور ان کے شعر دِل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

اُن کے مجموعۂ کلام میں ہر صنفِ سُخن کے اشعار ہیں۔ غزلوں کے علاوہ قطعات اور قومی نظمیں بھی ہیں۔ جن کے موضوعات حُب الوطنی، اتحاد اور یکانگت پر مبنی ہیں۔ اور ان میں جذبات نگاری۔ یگانگت اور پُختگیٔ کلام پائی جاتی ہے۔ بے عیب اور صاف سُتھرا کلام لکھنے میں اُنہیں بڑی مہارت حاصل ہے۔

اسلُوب اور لہجہ میں اتنا اثر ہے کہ قاری میں حرکت و ہیجان پیدا کرنے کا اُنہیں سلیقہ

بھی آتا ہے اور زیادہ سے زیادہ اشخاص کو اپنے کلام سے متاثر کر سکتے ہیں۔ مشکل سے مشکل مضامین کو حسین اور لطیف پیرایہ میں پیش کرنا بھی انہیں آتا ہے۔ جو حسنِ بیان اور تخلیق کا اہم جزو ہے۔

الفاظ میں نغمگی کے کئی رنگ ان کے کلام میں نمایاں ہیں۔ جس کا موسیقی سے گہرا تعلق ہے۔ ایک اچھے شاعر کا ان مختلف رنگوں سے شناسا ہونا بہت ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے فن پاروں میں آہنگ اور غنائیت پیدا کر سکے۔ شاعر میں الفاظ کی نغمگی کی جتنی حِس تیز ہوگی۔ اس کی شاعری اتنی ہی مسحور کن اور دلکش ہوگی۔

یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ادب کا ہر دور میں اپنا ایک منفرد آہنگ ہوتا ہے۔ غدر کے بعد ادب میں جو رنگ پیدا ہوا وہ انقلابی۔ محبت کا ہیجان اور انسانی زندگی کے سارے مظاہر کو ساتھ لے کر آیا۔ اور اس نے ایک فسوں کاری کو جنم دیا۔ کیونکہ دنیا میں وہی ادب زندہ رہ سکتا ہے۔ جو ارفع اور اعلیٰ ہو۔ وہی شعر بہتر ہے جو عہد آفرین ہے۔ اور اس میں ایک خاص پیغام اور تاثر مضمر ہو۔

جگر صاحب نے فرسودہ۔ بے جان اور مصنوعی فکر و نظر سے ہمیشہ اجتناب کیا ہے اور اس بات کی کوشش کی ہے کہ جھوٹی روایات کی بجائے مثبت قدروں سے رشتہ جوڑا جائے اور جاندار روایتوں کی پاسداری کی جائے۔ شعری اور ادبی لب و لہجہ کے اعتبار سے جگر ایک نمایندہ شاعر ہیں۔ ان کی ذکاوت اور درد کی غزلوں اور نظموں میں نمایاں ہے۔ اور لب و لہجہ میں تندی اور تیزی بھی۔ ہیئت اور تکنیک کے لحاظ سے ایک طرح کا نیا پن بھی موجود ہے۔ جدت۔ انفرادیت اور بانکپن کی بہت خوب صورت مثالیں بھی ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کے مستقبل سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔

شعر کو پہلے ایک اچھا شعر ہونا ضروری ہے دیگر باتیں بعد میں آتی ہیں۔ شعر کا

علمی، سیاسی اور سماجی پیکر بھی سامنے ہو۔ اور شعر کے لیے خوب صورتی پہلی شرط ہے۔ جذبہ و تخیل کی بنیاد شاعر کے اپنے زمانے کی ہے جو کائنات و حیات کی حقیقتوں پر مبنی ہے۔ جگر نے اپنی شاعری کو خونِ جگر پلایا ہے اس لیے پنجاب کے شعرائے کرام کا ذکر جگر کے نام کے بغیر نامکمل ہو گا۔ ہر دانش ور عہد آفریں ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے تہذیبی ورثہ چھوڑ جاتا ہے۔ ان کی حریمِ ذات میں لطافتِ احساس بھی ہے اور اہتزازِ شعور بھی۔ کیونکہ شعر ایک آسمانی زبان ہے۔ ●

●

صاف گوئی سے کیا لیا ہم نے؟
سب کو دشمن بنا لیا ہم نے؟

(جگر جالندھری)

●

غیر نیچا خود بہ خود ہو جائے گا
خود کو پہلے اس سے اونچا کیجیے

(جگر جالندھری)

●

گنپت سہائے سریواستو مضطر جھانسوی

دردِ جگر
پر
ایک تجزیاتی اور تنقیدی نظر

گذشتہ تین دہائی کے قلیل عرصہ میں جناب جگر جالندھری کا اپنے کلام کے پانچ مجموعے منظرِ عام پر پیش کرکے اصحابِ علم و فن سے خراجِ تحسین و ستایش وصول کرنا اُن کی وہبی سخن سنجی اور قادر الکلامی کی دلیل ہے۔ وہ اپنی خوش کلامی اور شگفتہ گوئی کی بنا پر متعدد لٹریری ایوارڈ اور اعزاز سے سرفراز ہو چکے ہیں۔ وہ معروف و ممتاز شعراء کی صف میں ایک امتیازی شان سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔

حالانکہ جناب جگر نے ہر صنفِ شاعری میں کامیابی کے ساتھ بہت کچھ کہا ہے۔ مگر ان کی محبوب صنف غزل ہے جس میں انہوں نے خصوصاً جدید روایتی رنگِ تغزل کو اپنایا ہے۔ مگر ترقی پسند شاعری کی پسندیدہ اقدار سے بھی مطلقاً منہ نہیں موڑا ہے۔

غزلوں میں انہوں نے شاعری کی گوناگوں موضوعات یعنی عشقیہ جذبات، دورِ حاضر کی سیاسی و سماجی ماحول کی ناگفتہ بہ حالات اور تہذیب کی پستی کے تلخ تجربات، اور

صداقت و حقیقت پر مبنی فلسفیانہ تخیلات وغیرہ مضامین پر بہترین سبق آموز اور دیدہ زیب اشعار پیش کیے ہیں۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ سادہ و عام فہم زبان میں بُلند سے بلند اور دقیق رموز و نکات کو بڑی خوبی سے قلمبند کر جاتے ہیں۔ حُسنِ زبان کی دلکشی اسلوبِ بیان کی نُدرت اور مضامین کی جدت سے دل و دماغ پر وجد کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔

مجھ احقر سے "دردِ جگر" کی نسبت اپنے تاثرات کا اظہار کرنے کی التجا کی گئی ہے مگر کب؟ جب میں اضمحلالِ جسمانی اور ضعفِ بصارت و سماعت سے اسّی برس کی عمر میں کچھ لکھنے پڑھنے سے معذور ہو گیا ہوں۔ جب جگر صاحب کی نسبت شہنشاہِ تغزل جناب خمار بارہ بنکوی، ابوالبلاغت جناب رتن پنڈوروی، سحابِ سخن مولانا ابر احسنی گنوری، ممتاز الشعراء جناب ساحر ہوشیارپوری اور علامہ امر چند قیس جالندھری (ایسے باکمال شعراء) اپنے تاثرات کا اظہار فرما چکے ہیں تو اس ہیچمدان کا کچھ مزید کہنا زیب نہیں دیتا۔ لیکن اس التجا کو ٹھکرایا بھی نہیں جا سکتا کیونکہ جناب جگر میرے قدیم کرمفرما اور قدرداں رہے ہیں۔

کلامِ جگر کی چند نمایاں خصوصیات:-

● معرکۂ حُسن و عشق

جنابِ جگر کا معیارِ عشق بہت بُلند ہے۔ وہ حُسن کی شان و وقار کے ساتھ ساتھ عشق کی خودداری و احترام کا بھی لحاظ رکھتے ہیں۔ ان کا عاشق رُسوا اور ذلیل قسم کا نہیں ہوتا۔ اور نہ ان کا محبوب بازاری اور بے وفا ہوتا ہے۔ وہ حُسن و عشق کو ہم مرتبہ اور ایک دُوسرے کا پورک سمجھتے ہیں۔ اِن کے مندرجہ ذیل چند اشعار اس دلیل کی تائید کرتے ہیں:

دونوں کا ایک حال محبت نے کر دیا ٭ اُن کو قرار ہے نہ مجھ کو قرار ہے

وہ حُسن کیا ہے جس کو نہیں پاس عشق کا
جو دُور ہو نیاز سے، وہ ناز کچھ نہیں

❁

ہم تو مشتاقِ دید ہیں بے شک
اُن کو بھی شوقِ خود نمائی ہے

❁

بے شک تم جو حُسن میں ہو، میں ہوں عشق میں
میرا جواب ہے نہ تمہارا جواب ہے

❁

واد اُلفت کی پا رہا ہوں میں
ان کو بھی یاد آ رہا ہوں میں

❁

گُل سے بلبل، شمع کے نزدیک پروانہ رہے
کس طرح پھر دُور تجھ سے تیرا دیوانہ رہے

❁

یہ نقابِ روئے تاباں تم نہ سرکانا
سمجھ کر شمعِ روشن، آ نہ جائے کوئی دیوانہ

❁

سرورِ عشق مجھ کو ہے، غرورِ حسن تجھ کو ہے
اِدھر میں بھی ہوں مستانہ اُدھر تو بھی ہے مستانہ

❁

میں نہ جاؤں گا تیرا در چھوڑ کر
جان دے دوں گا یہیں سر پھوڑ کر

٭

ڈالتے ہو کس لیے رُخ پر نقاب
چھُپ بھی سکتا ہے کہیں یہ آفتاب

٭

رُخِ تاباں نے ترے آگ لگا دی دِل میں
میں جسے پھُول سمجھتا تھا وہ شعلہ نکلا

٭

ہم سمجھتے تھے اِسے وجہِ سکوں
اور تڑپایا ترے دیدار نے

٭

سَو بہاروں کی ہے بہار جگرؔ
اُن کا رہ رہ کے مُسکرا دینا

٭

بہار اپنی ہے کیا، اپنی خزاں کیا؟
تمہارا مُسکرانا، رُوٹھ جانا

٭

دُکھ کے کانٹے بھی پھُول ہیں سُکھ کے
پیار کی رُت بڑی سُہانی ہے

٭

ہو سکے گا نہ جدا ہو کے جدا بھی مجھ سے
میری نظروں کے مقابل تری صورت ہوگی

*

دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے ہمیں
کتنی ظالم ہے تیری انگڑائی

*

: مندرجہ بالا چند عشقیہ اشعار کی لطافت، رنگینی اور دلآویزی کی تعریف حرفِ بیان سے باہر ہے۔ بلاشبہ جناب جگر اپنا ہر شعر بڑی کاوش کے ساتھ کہتے ہیں۔ تبھی تو انھوں نے فرمایا ہے: ؎

تخلیق کیا شئے اِسے اپنے لہو سے
کہتے ہیں جسے شعر مرا لختِ جگر ہے

سیاسی و سماجی ماحول کی پستگی کے تلخ تجربات:

لوگ کتنوں کے گھر جلاتے ہیں
اپنے اِک گھر کی روشنی کے لیے

*

جو پھول ہے کانٹے کی طرح سوکھ گیا ہے!
کانٹا جو ہے شاداب ہے! معلوم نہیں کیوں

*

مرگھٹ میں پڑی لاشوں کی مانند جگر! آج
ہر شخص اداس ہے! معلوم نہیں کیوں

*

خزاں نے کر دیا اتنا افسردہ دل کہ ہمیں
بہاروں میں بھی بہاروں کا انتظار رہا

٭

لوگ مٹی میں ملا دیتے ہیں آنسو کی طرح
آج کی دنیا میں انساں کی کوئی قیمت نہیں

٭

ادب آداب کی رسموں کو نئی نسل کے لوگ
کہہ کے فرسودہ خیالات بدل دیتے ہیں

٭

ہم سائے اب اتنا بھی گوارا نہیں کرتے
ہل جائے جو دیوار سے دیوار کا سایہ

●

● صداقت و حقیقت پر مبنی چند فلسفیانہ اشعار

●

دہ کے خاروں کے ساتھ گل کی طرح
اپنا دامن بچا لیا ہم نے

٭

اُن کے قدم نہ چوم سکیں منزلیں کبھی
راہی جو اپنے پاؤں کی چھاؤں میں گھر گئے

٭

یاد کی ٹیس کہاں جاتی ہے!
وقت سے زخم تو بھر جاتے ہیں

٭

دونوں پہلو ہیں زندگانی کے
اَبر کا سایہ، دُھوپ کی گرمی

٭

شاہوں کے مقبروں پہ ذرا غور سے نظر
یہ مرتبہ، یہ شان، یہ اعزاز کچھ نہیں

٭

غم سے نہ دِل شکستہ ہوئے ہم یہ سوچ کر
مضراب سے شکستہ ہو جو ساز - کچھ نہیں

٭

دِل کا کتنا بھی ہو مضبوط کوئی شخص مگر
پھر بھی حالات، خیالات بدل دیتے ہیں

٭

کیوں کثرتِ غم میں نہ ہوں کم دوست ہمارے
جب دُھوپ بڑھی گھٹ گیا دیوار کا سایہ (جدّتِ تشبیہہ)

٭

غیر نیچا خُود بخُود ہو جائے گا
خُود کو پہلے اُس سے اُونچا کیجیے (بہترین جدّت)

٭

● ترقی پسند شاعری کے چند نمونے

جگر! اِن پتھروں کی دنیا میں
خاک ہوگی تیری یہ شنوائی!

٭

کیا ہوا سے بھی یہاں ڈرتے ہیں سب لوگ اے جگر!
جس مکاں کو دیکھتا ہوں اُس کی کھڑکی بند ہے

٭

دُھوپ میں خُود جلیے پیڑوں کی طرح
دُوسروں پر اپنا سایہ کیجیے

٭

جب زمانے کے ساتھ چلنا ہے
کیوں نہ پتھّر کو آئینہ کہیے

٭

تمہارے شہر میں تا گھر سے نکلنا سخت مُشکل ہے
جدھر دیکھو، جہاں دیکھو۔ وہیں چنگیز بیٹھے ہیں

٭

● مختلف مضامین اور بُلند تخیّلات پر مبنی چند بصیرت افروز اشعار

کیا بھلی صُورت تیری اِس پر بُری عادت تیری
ریشمی کپڑے میں یعنی ٹاٹ کا پیوند ہے

٭

اپنی صورت دیکھ کر حسن اتنا اتراتا ہے کیوں
رہنے والی ایک صورت پر کوئی صورت نہیں

*

آدمی کچھ بھی نہیں ہے آدمیت کے بغیر
پھول وہ کیا پھول ہے جس پھول میں نکہت نہیں

*

آگ کی زد میں ہیں سبھی گلشن
ہم کہاں لے کے آشیاں جائیں!

*

انساں نے سنبھال لیا کاروبارِ موت
یعنی فرشتہ موت کا بے کار ہوگیا

*

آج آدمی کی تنگ نگاہی نہ پوچھیے
آزاد ہو کر اور گرفتار ہوگیا
مقتول کی طرف تو کوئی دیکھتا نہیں
قاتل کا اک زمانہ طرفدار ہوگیا

*

زندگی گنتی ہے سانسوں پر
شمع یہ جلتی ہے ہواؤں میں
(جدتِ تشبیہ)

ایسی موجوں سے بچنا نا ممکن
چھُپ کے رہتی ہیں جو کناروں میں

☆

کل جو شامل تھے قاتلوں میں جگر!
آج بیٹھے ہیں سوگواروں میں

☆

آدمی وہ نہیں۔ حالات بدل دیں جن کو
آدمی وہ ہیں۔ جو حالات بدل دیتے ہیں
جب سمجھ لیتے ہیں وہ کوئی نہیں اِس کا جواب
باتوں باتوں میں مری بات بدل دیتے ہیں
اُن کے دِن رات بدلتے ہوئے دیکھے نہ جگر
اِک زمانے کے جو دِن رات بدل دیتے ہیں

☆

حالِ دِل کہیے بھی کِسی سے تو کیا!
ایک سا سب کا حال ہے پیارے!
کِسی ظالم کو کہہ سکے ظالم
کِس کی اِتنی مجال ہے پیارے!

☆

نگاہیں پھیر لی ہیں کیا کِسی نے!
زمانہ ہم سے کترانے لگا ہے

جب بھی ملتی ہے خوشی۔ دل میں چھپا لیتا ہوں
جانتا ہوں۔ یہ جہاں والے چرا لیتے ہیں
بجلیاں کس لیے ناحق کوئی تکلیف کریں
اپنے گھر کو ہمیں جب آگ لگا لیتے ہیں

☆

شورِ فریاد ہے جہاں جائیں
ہم کہاں لے کے سسکیاں جائیں
راہیں ڈستی ہیں ناگنوں کی طرح
راہرو کیا کریں؟ کہاں جائیں

☆

نوٹ: مندرجہ بالا چند شعر جنابِ جگؔر کی بلند نظری اور جدّتِ بیان کی مثالیں ہیں۔ ایسے تیر و نشتر سے ان کا مجموعۂ کلام "دردِ جگؔر" بھرا پڑا ہے۔ انہیں خود پڑھیے اور واہ واہ کہتے جائیے۔ ان اشعار کی اگر تشریح اور وضاحت کی جاتی تو مقالہ بہت طویل ہو جاتا۔ ان کی سادہ زبان اور مفہوم اتنا صاف ہے کہ قاری انہیں خود بڑی وضاحت کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔

شعر و شاعری کے مشغلے سے جنابِ جگؔر کو والہانہ عشق ہے۔ وہ سخن گوئی کو عبادت کا درجہ دیتے ہیں، چنانچہ فرمایا: ؎

نہیں شعر و سخن سے سرسری وابستگی میری
یہی ہے بندگی میری یہی ہے آرتی میری

دعا گو ہوں کہ ربّ العالمین جنابِ جگؔر کو طولِ حیات بخشے تاکہ وہ عرصہ تک ادب کے خزانہ میں اپنی بے مثل سخن گوئی سے اضافہ کرتے رہیں۔ آمین۔ ●

ہردیال شوقؔ

جگتؔ جالندھری

(ایک منفرد آواز)

جناب دھرم پال مرداہا المتخلص بہ جگتؔ جالندھری پنجاب کے اُن گنے چُنے اُردو شعراء میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ جنہوں نے تقسیم وطن کے بعد اُردو زبان کو اپنا کر نہ صرف اُردو شاعری کی قندیل کو فروزاں رکھا۔ بلکہ اس کی آب و تاب میں مزید اضافہ کر کے اس عام تاثر اور احساس کی تردید کر دی۔ کہ بھارت اُردو کی جائے ولادت اور پناہ گاہ نہیں ہے۔ یا کہ یہاں اُردو کا مستقبل تاریک ہے۔ یا کہ یہ زبان اپنی ہر دلعزیزی کے جوہر سے معرا ہو چکی ہے۔ یا کہ اس کا درشہ کسی مخصوص مذہب۔ علاقہ یا فرقے سے منسوب ہے۔ اس کے برعکس اُردو زبان نہ صرف کسی ایک علاقہ تک محدود ہے۔ نہ کسی خاص طبقہ کی جاگیر ہے۔ بلکہ یہ حقیقت ہے کہ اُردو زبان ہی کسی حد تک بھارت کے عوام میں بین اللسانی اور بین الطبقاتی ارتباط کا ذریعہ ہے۔ غیر منقسم پنجاب بھی اگر لاہور اُردو ادب کا گہوارہ

سمجھا جاتا تھا۔ تو تقسیم کے بعد کا پنجاب بھی (بشمول ہریانہ) فخریہ طور پر اس زبان کی ترویج و ترقی کا علمبردار قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس امر کا بیّن ثبوت وہ شعراء حضرات بھی ہیں۔ جنہوں نے تقسیم کے بعد اُردو سے متعلق کسل و جمود کے عالم میں اور اُردو تعلیم کی راہ میں مشکلات کے باوجود اُردو میں شعر کہنا شروع کر کے اس فن میں شہرت اور ناموری حاصل کی۔ جنابِ جگّر کا نام بلا مبالغہ ایسے شعراء میں لیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے نامساعد حالات میں بھی اُردو شاعری کے میدان میں کامیابی کے ساتھ شہسواری کی۔ جنابِ جگّر کی تخلیقات اور شاعرانہ صلاحیتوں کی روشنی میں یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعرانہ فن ایک خُداداد عطیہ ہے اور خالص شاعری کسی جبر یہ آورد کے نہیں بلکہ فطری اور طبعی آمد کی مرہُونِ احسان ہے۔ کسی فن میں حصُولِ کمال کے لیے مُناسب رہنمائی ناگزیر سہی — تاہم طبعِ موزُوں اور قُدرتی میلان کی موجُودگی بھی از بس ضرُوری ہے۔ جو جنابِ جگّر میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے۔ اس پر ابوالفصاحت پدم شری جوشؔ ملسیانی (مرحُوم) اور اُن کے جانشین جناب ساحرؔ سیال کوٹی (مرحُوم) کی رہنمائی نے جنابِ جگّر پر سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ یہ سلسلہ حضرت داغؔ دہلوی کے دبستانِ شاعری سے مِلتا ہے۔ اور جنابِ جگّر کے کلام کی صفاتِ حسنہ میں اس دبستان کی خُوبیوں کی جھلک ملتی ہے۔

جنابِ جگّر کی پیدائش ۱۸ جنوری ۱۹۳۵ء کو ضلع امرت سر کے ایک سرحدی گاؤں سارنگ دیو میں ہوئی لیکن تقسیمِ مُلک کے بعد غیر یقینی سیاسی حالات کے پیشِ نظر اُنہوں نے جالندھر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ وہیں سے ہی گریجویشن کر کے قانون کی ڈگری (LL.B) حاصل کی۔ لیکن ایڈووکیٹ کے بجائے پنجاب راجیہ بجلی بورڈ میں ملازمت اختیار کر لی اور کافی عرصہ سے پٹیالہ میں تعینات اور مقیم ہیں۔

جگّر صاحب جہاں ایک طرف خوش مزاج۔ خلیق اور وجیہہ شخصیت کے مالک ہیں

وہاں دوسری طرف شاعری میں بھی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کے کلام میں اُنکی طبعی خوش سلیقگی۔ سادگی۔ وجاہت۔ متانت اور خودداری کے عناصر ملتے ہیں۔ اُن کے پانچ شعری مجموعے: سوزِ جگر۔ (۱۹۷۲ء) لختِ جگر (۱۹۷۹ء) خونِ جگر (۱۹۸۲ء) اندازِ جگر (ہندی) (۱۹۸۷ء)۔ اور دردِ جگر (۱۹۹۰ء) منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان کا کلام مختلف ریڈیو اور ٹیلی ویژن مراکز سے نشر ہوتا رہتا ہے۔ نیز ملک بھر کے سرکاری و غیر سرکاری رسایل و جراید میں شایع ہوتا ہے۔ مختلف اہم مشاعروں میں مدعو کیے جاتے ہیں۔ وہ پنجاب یونی ورسٹی سے بہترین شاعر کا اعزاز اور انعام حاصل کر چکے ہیں۔ روٹری کلب اور لائنز کلب سمیت وہ لگ بھگ چوبیس [24] اداروں سے اعزازات اور انعامات سے نوازے جا چکے ہیں۔ اُردو شاعری کے کئی اکابرین نے جگر صاحب کے کلام پر خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

جنابِ جگر نے ویسے تو اُردو شاعری کی کئی اصناف میں کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن غزل ان کا ملجا و ماوا ہے۔ بدقسمتی سے آجکل غزل چند نامعلوم وجوہات سے معتوب و مطعون قرار دی جا رہی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ غزل نے ہی اپنی بے پناہ لطافت اور نزاکت کے باعث اُردو زبان کا پرچم سربلند رکھا ہوا ہے۔ اور اس کے برخلاف کوئی بھی سازش کارگر ثابت نہ ہوگی۔ اُردو غزل سے محظوظ ہونے کے لیے عوام مشاعروں میں جوق درجوق کھنچے چلے آتے ہیں اور موسم اور وقت کی سختی کی پرواہ کیے بغیر مشاعروں کے اختتام تک ڈٹے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر بشیر بدر کے الفاظ میں: "اُردو زبان کی رُوح غزل کی لطافت اور شعریت میں پوشیدہ ہے" غزل کی بدولت ہی اُردو مشاعرہ بذاتِ خود ایک تاریخی۔ ادبی انسٹی ٹیوشن بن چکا ہے۔ اور یہ بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ: ع پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

قیاس غالب ہے کہ اُردو غزل کی مخاصمت اس کی ہر دلعزیزی اور عام پذیرائی سے متعصبانہ برتاؤ کا نتیجہ ہے۔ ورنہ اس سے اُردو شاعری کی کسی دوسری صنف کو نہ تو کوئی

گزند پہنچ سکتا ہے۔ نہ ہی غزل کے اخراج سے دوسری اصنافِ شاعری پر کوئی موافق اثر پڑے گا۔ بلکہ موجودہ ماحول میں غزل سے بے اعتنائی اُردو ادب اور زبان کے انجام کا آغاز ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ امر بھی ملحوظِ خاطر ہونا چاہیے کہ غزل کی ابتداء عشقیہ شاعری سے ہی۔ آج اس کا دامن بہت ہی کشادہ، وسیع اور متنوع ہو چکا ہے۔ معنوی اور موضوعاتی اعتبار سے آجکل کی غزل عہدِ عتیق کی غزل سے کافی حد تک مختلف ہے۔ اس کی تہوں میں مختلف بلکہ متضاد خیالات بھی اور بیک وقت سما سکتے ہیں اور اس سے غزل کی ہیئت یا وحدت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ دورِ حاضرہ کی غزل میں زمانے کی معاشرت اور تہذیب کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ اس میں سامعین اور قارئین اپنے احساسات اور جذبات کی بازگشت پاتے ہیں اور اُن کا ایسا تاثراتی ردِ عمل انہیں غزل کی طرف راغب کرتا ہے۔ غزل کے جواز کی کسی تشریح سے مراد نظم یا کسی دوسری صنفِ سخن کی کم اہمیتی نہیں ہے۔

جناب رحیم کی شاعری کی کشش اور انفرادیت میں کئی عناصر کار فرما ہیں۔ ان کے کلام۔ بالخصوص غزل میں سلاست ہے، شعریت اور نغمگی ہے، چستی اور بے ساختگی ہے۔ اس میں حسن اور آرائش اور طرزِ بیان اور زبان کی شستگی ہے۔ بالفاظِ دیگر حسنِ باطن اور حسنِ ظاہر کا اجتماع ہے۔ ان کی بیشتر تخلیقات چھوٹی دل پذیر بحور میں ہیں۔ جو براہِ راست قاری یا سامع کے دل کو چھوتی ہیں۔ اور وہ ان میں اپنے احساسات اور جذبات کی گونج پہچانتا ہے، ان کی زبان سہلِ ممتنع کی مثال ہے۔ گنجلک تراکیب سے احتراز کیا گیا ہے۔ انہوں نے زندگی کے تلخ تجربات، عشق کے سوز و گداز۔ غمِ ہجر۔ تصوف۔ عرفان، عصری آگہی۔ خودداری اور حبِ وطن وغیرہ جیسے موضوعات پر اپنے دلکش انداز میں خامہ فرسائی کی ہے۔ جذباتی رکاکت اور ابتذال سے ان کا کلام پاک ہے انہیں علم عروض سے کماحقہٗ واقفیت ہے۔ اور فنی پختگی

حاصل ہے۔ مُلک کے نامور اہلِ قلم سے اُنہوں نے خراجِ تحسین حاصل کیا ہے۔ چند مشاہیرِ سخن کی آراء کا منجملہ ذکر اس مقام پر غیر واجب نہ ہوگا:

● ابوالفصاحت جناب جوش ملسیانی (مرحوم و مغفور)

"زبان اور فن کی تحقیق کے شیدائی اور حُسنِ سُخن کے فدائی ہیں۔ طبیعت شاعری کے لیے بہت موزوں ہے۔ ان کی صحیح قسم کی موزونیِ طبع پیچیدہ بحروں میں بھی صحیح کہنے پر قادر ہے۔ تخیّل اور زبان کو دوش بدوش رکھ کر شعر کہتے ہیں۔ ہر قسم کی عُریانی اور بازاری زبان سے بچ کر شعر کہتے ہیں۔ خوش بیانی ان کی طبعِ سلیم کا جوہر ہے۔"

● جناب شہابِ سخن مولانا ابی احسنی گنوری (مرحوم و مغفور)

"جگر شعر کے مزاج کو بھی ایک طبیبِ حاذق کی طرح جانتے ہیں اور ان میں الفاظ کے استعمال برمحل کا بھی عرفان ہے۔"

● جناب گنپت سہائے سری واستو سابق ریسرچ اسکالر الٰہ آباد یونیورسٹی

"جناب جگر جالندھری ایک نہایت خوش گو اور خوش فہم شاعر ہیں۔ خداداد موزونیِ طبع کے باعث ان کے کلام میں آورد اور تصنّع کی بجائے آمد اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔"

● جناب ساحر سیالکوٹی:

"شعر و سخن سے اُنہیں رغبت فطرتی ہے۔ اور وہ شعر کے حُسن و قبح کو بخوبی سمجھتے ہیں۔ اس لیے شعر کہتے ہوئے ان کی شعر کے تمام پہلوؤں پر نظر ہوتی ہے۔ شعر کی زبان صاف۔ سادہ اور سلیس ہوتی ہے۔"

● جناب خمار بارہ بنکوی

"جناب جگر جالندھری اچھے شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے انسان بھی ہیں۔"

وہ جو کچھ کہتے ہیں اُسے محسوس بھی کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اُن کے اشعار قاری یا سامع کے دِل پر فوراً اثر کرتے ہیں۔"

● ڈاکٹر بشیر سیفی

"جناب جگر جالندھری نے اپنے فطری شاعرانہ جوہر کی تربیت میں یقیناً بڑا ریاض کیا ہوگا۔ تب جا کے وہ زبان و بیان کی ان بلندیوں کو چھو سکے ہیں۔ اب اُن کے آدابِ فن کے ساتھ عصری زندگی کا شعور بھی آملا ہے۔"

● جناب ساحر ہوشیارپوری

جگر جالندھری کو موزونیِ طبع مبدأ فیاض سے عطا ہوئی۔ زود گوئی اور پُرگوئی کا وصف اُن کی ذاتی صلاحیتوں کا ثمرہ ہے۔ خوش فکری کا ملکہ مشقِ سُخن کی دین ہے۔ اور صفائی بیان و سادگی اور زبان کی شستگی کا جو دبستانِ داغ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے اُستادِ محترم جناب ساحر سیالکوٹی کی تربیت و رہنمائی کی مرہونِ منت ہے۔ جگر صاحب کا کلام عیوب سے پاک اور شعری محاسن کا ایک ایسا پیکرِ جمیل ہے جو قاری کے ذہن و دِل کو فرحت اور رُوح کو بالیدگی سے ہمکنار کرتا ہے۔"

وغیرہم۔ یہ سلسلہ طویل ہے۔ اور یہ محدود مقالہ ان کی اجازت نہیں دیتا۔
اب جگر صاحب کے چند اشعار نمونتاً پیشِ خدمت ہیں:

حسرتوں کا ہو گیا ہے اس قدر دل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

☆

بند کمرے میں مری سانس گھٹی جاتی ہے
کھڑکیاں کھولوں تو زہریلی ہوا آتی ہے

☆

منظور کسی کو بھی نہیں خاک میں ملنا
آنسو بھی لرزتا ہوا آنکھوں سے گرا ہے

٭

یاد کی ٹیس کہاں جاتی ہے؟
وقت سے زخم تو بھر جاتے ہیں

٭

کیا کرشمے تھے رہنماؤں میں
لوگ بٹنے لگے خداؤں میں

٭

عشق کا اک گناہ کرکے جگر!
بچ گئے ہم کئی گناہوں سے

٭

زندگی پھول بھی ہے کانٹا بھی
زندگی نغمہ بھی ہے نوحہ بھی
زندگی دھوپ بھی ہے سایہ بھی
زندگی کوہ بھی ہے دریا بھی
آدمی عمر بھر رہا حیران
زندگی کی نہ ہو سکی پہچان

٭

سب زندگی کو کہتے ہیں اک دردِ سر مگر
مرنے کے واسطے کوئی تیار بھی نہیں

٭

سب زندگی کو کہتے ہیں اک دردِ سر مگر
مرنے کے واسطے کوئی تیار بھی نہیں

٭

مادرِ ہند قسم کھاتے ہیں ہم سب مل کر
کسی صورت بھی تری آن نہ جانے دیں گے
جان جانے کے لیے ہوتی ہے اس کا کیا ہے
جان دے دیں گے۔ تری شان نہ جانے دیں گے

٭

جنابِ جگر کے چیدہ و نمایندہ اشعار کا سلسلہ لامتناہی ہے۔ لیکن جگہ کی کوتاہی ان کے بیان میں مانع ہے۔ ان کا ایک ایک شعر شعریت و معنویت کا عکس ہے۔

؎ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

اندھوں کی نگری

پیار کی باتوں سے کیا اِن کو غرض
دِل میں جو کینے لیے پھرتے ہیں
کس لیے اندھوں کی نگری میں جگر
آپ آئینے لیے پھرتے ہیں

(جگر جالندھری)

ہیرانند سوزؔ

جگرؔ جالندھری

"دردِ جگر" کی روشنی میں

جگرؔ جالندھری نے اُستاد داغؔ کے مکتبۂ فکر کو اساس بنا کر شعر و شاعری کی دُنیا میں قدم رکھا اور اپنی موزونیِ طبع اور ذہنی میلان کے طفیل بہت جلد اس صنفِ ادب میں قابلِ قدر مقام حاصل کر لیا۔ وہ بلاشبہ ایک طباع، ذہین اور مخلص شاعر ہیں اور اپنے نظریات، مشاہدات اور محسوسات کو غیر پیچیدہ اسلوب میں بے تکلفی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ طبعِ سلیم کا یہ جوہر انہیں قدرت کی طرف سے تو ودیعت ہوا ہی ہے حضرت جوشؔ ملسیانی اور جناب ساحرؔ سیالکوٹی کے حلقۂ تلامذہ میں رہ کر اُن کا طرزِ سخن اور بھی صیقل ہوا ہے اور اُن کے شعور میں پختگی اور زبان و بیان میں صفائی اور چستی آئی ہے۔ اُن کے کلام کی ایمائیت۔ لطافت۔ بصیرت اور نفاست سے انکار نہیں ہو سکتا۔ اُنہوں نے اپنی شاعری میں ابلاغ اور سادگی کا پوری طرح خیال رکھا ہے۔ اُن کے پانچ شعری مجموعے۔ "سوزِ جگر"

"بختِ جگر" ۔ "خونِ جگر" ۔ "اندازِ جگر" ۔ اور "دادِ جگر" منصۂ شہود پر آکر مقبولیت حاصل کر چکے ہیں اور اِن میں بعض کو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں سے اعزازات بھی حاصل ہوئے ہیں اُن کا کلام پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اُنہوں نے نہایت صدق دِلی اور خلوصِ نیت سے دبستانِ داغ کے اصول و ضوابط کا التزام کیا ہے اور اُن کے اندازِ فکر اور اسلوب کو اپنی خوش فکری اور سحر بیانی سے سنوارا اور نکھارا ہے ۔ سہلِ ممتنع ان کی شاعری کی خصوصیت ہے ۔ اُنہوں نے آسان اور سلیس زبان اور پختہ انداز میں شُستہ اور شگفتہ اشعار کہے ہیں ۔
جگر صاحب کی شاعری ایک ایسا آئینہ ہے جس میں اُن کے احساس کی نزاکتیں اور لطافتیں اُن کے متخیلہ کا انداز ان کے فکر کی گہرائیاں اور وسعتیں یکجا ہو کر ایک کلیت کی صورت میں نظر آتی ہیں ۔ اِس کے ساتھ ہی اُن کی شاعری نشاط انگیزی کے دھوپ رنگ میں ایک نیا اندازِ بصیرت فراہم کرتی ہے ۔ اُن کا شعری لحن بھی ایک خوبصورتی پیدا کرتا ہے جسکی بنا پر اُن کی شاعری کا قرینہ اور معیار دونوں الفاظ میں ملفوف نظر آتے ہیں ۔ یہی اُنکی انفرادیت ہے ۔ اُنہوں نے دبستانِ داغ سے اپنے روایتی رشتوں کے ساتھ ساتھ نئے نئے شعور کے تحت تجربات بھی کیے ہیں اور انہیں مقبول بنانے کے لیے اُن کو نغمگی کیفیت اور فطری لہجے میں ڈھالا ہے ۔ اُن کی شاعری میں غنائیت کا رچاؤ ہے اور شعر کی موزونیت اور ذاتی تاثر کے اظہار کے لیے اُنہوں نے داغ اسکول سے انسلاک کے باوجود اپنے عہد کی جمالیاتی اقدار سے بھی اکتساب کیا ہے اور تخلیقی عمل میں نئی بصیرت اور شعوری سلیقگی کا پورا دھیان رکھا ہے ۔ اُن کی شاعری کو ہم اس لیے بھی زندگی کا آئینہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں حقیقت اور تغزل کے علاوہ تہذیبی اور معاشرتی قدروں کا عکس نظر آتا ہے اور کہیں کہیں روایت سے بغاوت کا بھی احساس ہوتا ہے ۔ جیسے یہ اشعار ۔۔۔

لوگ کہتے [illegible] جلا [illegible] ایک گھر کی روشنی کے لیے

اِس میں اِنسانیت تلاش نہ کر
اے جگرؔ یہ ہے آج کا اِنسان

٭

کیا کرشمے تھے رہنماؤں میں
لوٹ بیٹھے گئے خداؤں میں

٭

اہلِ ساحل کو مِلا کچھ بھی نہ جُز گردِ غُبار
غرقِ دریا جو ہُوئے لعل و گہر تک پہنچے

٭

اِن اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جگرؔ صاحب اپنے کلام میں آفاقی اور تابندہ قدریں بھی ملحُوظ رکھتے ہیں۔ اُن کی شاعری جہاں انسان دوستی عدل و انصاف۔ آزادی اور اخوّت جیسی مثبت اقدار سے عبارت ہے وہاں فِکر کی خلاقانہ کارفرمائی اور احساس کی دیانت داری بھی اُن کی شاعری کا خاصہ ہے۔ رُومان اور جمالیات کیونکہ اُن کے مزاج کا حِصّہ ہیں اِس وجہ سے اُن کے شعری پیرائے اکثر دِلنشیں اور خُوب صُورت بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار :ـ

زیرِ لب اُن کا مُسکرا دینا
دِل میں شہنائیاں بجا دینا

٭

اُن کو خُوشی میں اُن کی محبّت میں قید ہُوں
مُجھ کو خُوشی وہ میرے خیالوں میں گھِر گئے

٭

دل تڑپ کر نہیں تڑپاتا ہے
پیار میں لُطف بڑا آتا ہے

٭

دل رُبا بول ترے، رُوح فزا جلوے ترے
میرا عالم مرے جذبات بدل دیتے ہیں

٭

جگرؔ صاحب کے کلام میں آب و رنگ بھی ہے اور کیف و مستی بھی، اور مہک بھی ہے۔ پاکیزگی اور شائستگی بھی۔ انہوں نے غزل کی روایت سے انحراف نہیں کیا اور اجتہاد کے نام پر اس کا چہرہ مسخ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اشعار کی سادگی اور صفائی اور لہجے کی نرمی اُن کے اندازِ بیان کو حُسن عطا کرتی ہے۔ کہیں کہیں حزنیہ اندازِ بیان اُن کے شعروں میں سوز و گداز بھی پیدا کرتا ہے۔ ؎

اُن کے آنے پہ بھی آنسو مرے بہتے ہی رہے
ڈوب جاتے ہیں ستارے تو سحر ہونے تک

٭

حسرتوں کا ہو گیا ہے اس قدر دل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

٭

پلکیں روکیں خاک اشکوں کا ہجوم
تنکوں سے دریا نہ روکا جائے گا

٭

لب و لہجے کی درد مندی اور کسک اُن کی شاعری کو محض اظہارِ ذات کا وسیلہ نہیں بناتی بلکہ اُن کے کلام سے معاشرتی بدنظمیوں اور سماجی تقاضوں کا بھی شدّت سے احساس ہوتا ہے: ؎

مر چکا ہے ضمیر لوگوں کا
جو بھی جی چاہے آپ کا کہیے

؎

یہ دَور محبّت کا سبق بھول چکا ہے
اِس دَور کو ہے نانک و گوتم کی ضرورت

؎

اُنہوں نے غزل کے علاوہ نظم میں بھی مختلف موضوعات پر اپنی جولانیِ طبع کے جوہر دِکھائے ہیں۔ مُلک و قوم کی نامور ہستیوں کی تعریف و توصیف کے علاوہ اُنہوں نے داستانِ اُردو میں اُردو زبان کے رُوبہ زوال ہونے پر بھی اظہارِ غم کیا ہے۔ ان کے قطعات میں جہاں مختلف موضوعات ہیں وہاں رنگِ تغزّل بھی ہے۔ جگّر جالندھری کیونکہ اُستاد داغ اور حضرت جوش ملسیانی کی شعری روایت کے امین ہیں اِس لیے اپنی معتبر شاعری اور پُراثر لہجے کے طفیل ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہیں گے۔ ●

اِک رنگ میں گزار دی تُو نے تمام عُمر
اے پھُول تیری وضع کے قربان جایئے
(جگّر جالندھری)

ہر بھگوان شاد

شانِ پنجاب جگر جالندھری

فن اور شخصیت

جگر جالندھری پنجاب کے گلستانِ سخن کا ایک ایسا سحر طراز بلبل ہے جس کے دلکش، دل نواز، دل فریب اور دل افزا نغماتِ جمیل نے صرف قرب و جوار میں ہی نہیں بلکہ دُور دُور تک پڑھنے اور سننے والوں کے دلوں کو مسحور و بے خود کر دیا ہے۔ جگر جالندھری آسمانِ شاعری کا ایک ایسا پُر نور ستارا ہے جس کی چمک دمک سے شاعری کے کئی مخفی گوشے جگمگا اٹھے ہیں۔ جگر کی شاعری میں ایک ایسی حلاوت، ایک ایسی کشش، ایک ایسی جاذبیت ایک ایسی روشنی، ایک ایسی دل آویزی، ایک ایسی عظمت اور ایک ایسی محبت قدم قدم پہ پائی جاتی ہے۔ جو بہت کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے۔ جگر کا کلام اپنی ان گنت صفات اور خصوصیات کی بدولت اپنے قارئین اور اپنے سامعین کو باندھ لیتا ہے۔ یہ ہماری شاعری کی ایک ایسی منزل ہے، جس پہ شاعر سالہا سال کی محنت اور ریاضت کے بعد بمشکل پہنچتا ہے۔

جگر کا کلام اس لیے قابلِ داد ہے کہ اس نے مشاعری کو اپنی بندگی بنالیا ہے۔ ان کا ایک شعر اسی مضمون کی عکاسی انتہائی خوب صورت انداز میں کرتا ہے۔

نہیں شعر و سخن سے سرسری وابستگی میری
یہی ہے بندگی میری یہی ہے آرتی میری

فنِ شاعری کی تمام رموز اور تمام نزاکتوں سے روشناس جگر صاحب کی شخصیت بھی قابلِ قدر، قابلِ احترام اور قابلِ محبت ہے۔ زبان میں ایسی شیرینی اور مٹھاس کہ ایک بار ان سے ملنے والا ہمیشہ ملنے کا تمنائی رہتا ہے۔ بات کرتے ہیں تو زبان سے جیسے پھول جھڑتے ہیں۔ مرنجاں مرنج طبیعت۔ اس پر ان کی صاف گوئی اور راست گفتاری سونے پر سہاگہ کا کام دے رہی ہے۔ جگر صاحب کسی مشاعرے میں ہوں۔ گھر میں ہوں یا کسی ادبی محفل میں مداحوں کی بھیڑ انہیں ہمیشہ گھیرے رکھتی ہے۔ شعر و شاعری کے بے شمار شیدائی ہر روز ان سے آٹو گراف لے چکے ہیں۔ اُن کا ایک شعر دیکھیے جو اُن کی شاعری اور شخصیت کو اُجاگر کرتا ہے۔

جگر اچھا ہے یوں تو شاعر بھی
آدمی با کمال ہے پیارے!

جگر صاحب کے ادبی سفر کا آغاز میری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ میں نے اُنہیں مختلف ادبی مراحل طے کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ماضی و حال کے اساتذہ اور ممتاز جدید شاعروں کا کلام پڑھنے سننے کے ساتھ ساتھ چھپکے چھپکے شعر گوئی کا شوق انہیں کالج کی تعلیم کے دوران ہو گیا تھا۔ مگر اُن کا یہ ذوقِ شاعری اُن کی ذات یا ان کے چند ساتھیوں تک محدود تھا۔ ۵۶-۱۹۵۵ء یا شاید اس سے بھی کچھ عرصہ پہلے ہم نے جالندھر میں بزمِ ادب کی بنیاد رکھی۔ جناب ساحر سیال کوٹی

بزم کے صدر جناب سورج کنول سرور جنرل سیکریٹری اور راقم الحروف پریس سیکریٹری مقرر کیے گئے۔ بزم کے اہتمام سے کئی آل انڈیا اور صوبائی نوعیت کے شاندار مشاعرے کیے گئے۔ بزم نے متعدد گوشہ نشین شاعروں کو ڈھونڈ نکالا اور عوام کے سامنے پیش کیا۔ انہیں دنوں ایک خاموش طبع اور شگفتہ سا نوجوان ساحر سیالکوٹی کے ساتھ بزم کی ماہانہ ادبی نشستوں میں باقاعدگی سے آنے لگا۔ وہ سنتا۔ داد دیتا اور بس۔ ہاں بزم کے پبلک مشاعروں کے انتظامات میں وہ ہمیشہ سرگرم نظر آتا۔ ایک دن ہمارے پوچھنے پر ساحر صاحب نے بتایا۔ کہ اس نوجوان کا نام دھرم پال ہے۔ شعر سننے کا اسے بہت شوق ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد ہی نوجوان جگر جالندھری کے نام سے ہماری طرحی اور غیر طرحی نشستوں میں حصہ لینے لگا۔ انہیں ایام کی بات ہے۔ تکودر میں ایک دن ابوالفصاحت حضرت جوش ملسیانی نے بتایا کہ جالندھر سے جگر جالندھری نام کا ایک نوجوان اصلاح لینے کی التماس لے کر میرے پاس آیا تھا۔ پیرانہ سالی کی وجہ سے میں نے شاگردوں کو اصلاح دینے اور زیادہ لکھنے پڑھنے کا کام چھوڑ دیا ہے۔ مگر جگر کی موزوں طبع دیکھ کر میں نے اسے مایوس کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اور اسے اپنے ایک فارغ الاصلاح شاگرد ساحر سیالکوٹی کے پاس اصلاح لینے کی غرض سے بھیج دیا۔ اس طرح جگر صاحب نے حضرت ساحر سیالکوٹی کے روبرو زانوے تلمذ تہ کیا۔ ۱۹۷۲ء میں جگر جالندھری کا پہلا مجموعہ کلام "سوز جگر" کتابی صورت میں مارکیٹ میں آیا۔ کچھ عرصہ کے بعد قبلہ جوش صاحب نے مذکورہ مجموعہ کلام کے بارے فرمایا۔ جگر نے جس محنت۔ جس لگن۔ جس ہوشیاری اور جس سرگرمی سے فن شاعری حاصل کیا ہے۔ وہ میرے لیے بجا طور پر باعث اطمینان ہے۔ قبلہ نے اس بات کی خوشی ظاہر کی کہ جگر فن شاعری سے متعلق اپنے کئی شکوک رفع کرنے

کے لیے اکثر میرے پاس بھی آتا رہتا ہے۔

جگر کا کلام دیکھیے۔ گنگا اور جمنا کے مقدس پانی سے دُھلی ہوئی ٹکسالی زبان۔ لفظوں کا انتخاب قابلِ داد۔ بندش چُست کہ ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا۔ شاعری کے دبستانِ داغ کے مقررہ اصولوں پر سعادت مندی سے عمل پیرا ہیں۔ اور بلاخوفِ تردید یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ جگر نے شاعری کے جوش سکول کی عزت اور توقیر میں اضافہ کیا ہے۔ جگر اپنے معنوی جدِ امجد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بلا شبہ قدیم رنگِ تغزل کے دلدادہ ہیں۔ مگر شاعری کے جدید تقاضوں سے بھی اُنہیں گریز نہیں۔ ان کا کلام قدیم و جدید رنگِ سخن کا خوب صورت امتزاج ہے۔ اُن کے فن میں عصری زندگی کا شعور بھی آ گیا ہے اسی لیے ان کے ہاں زندگی کی توانائی اور فن کی رعنائی قدم قدم پر جلوہ گر نظر آتی ہے۔ جگر صاحب کے چند شعر دیکھیے جو محبت کی جدید اقدار سے لبریز، فن کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ کسی تبصرہ اور تشریح کے بغیر یہ شعر دیکھیے۔ جھوم جھوم کر پڑھیے اور داد دیجیے۔ ؎

مُدعا جینے کا کچھ اور بھی ہو سکتا ہے
تیرے وعدے پہ جیے ہوں یہ ضروری تو نہیں

٭

میری بہار کو موسم کا انتظار نہیں
کوئی جو ہنس کے ملا مل گئی بہار مجھے

٭

حسرتوں کا ہو گیا ہے اِس قدر دل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

٭

کوئی غم ہے نہ شادمانی ہے
کتنی بے کیف زندگانی ہے

☆

جتنے مجبور ہو گئے ہیں ہم
اتنے مغرور ہو گئے ہیں آپ

☆

اہلِ عزت میں تیری عزت بہت ہے اے جگر
وہ تجھے سمجھیں گے کیا جن کی کوئی عزت نہیں

☆

دامن اگر ہے صاف تو خاص احتیاط رکھ
اس پہ ذرا سا داغ چھپایا نہ جائے گا

☆

بند کمرے میں مری سانس گھٹی جاتی ہے
کھڑکیاں کھولوں تو زہریلی ہوا آتی ہے

☆

قارئین کرام کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اتنے خوبصورت شعر کہنے والے جگر صاحب کو باذوق طبقہ نے پسندیدگی کی خلعت سے سرفراز کیا ہے اور عوام کی اس حوصلہ افزائی کے نتیجہ کے طور پہ جگر صاحب گذشتہ ربع صدی کے عرصہ میں یکے بعد دیگرے نصف درجن سے زیادہ شعری مجموعے پیش کر چکے ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں "سوزِ جگر"، ۱۹۷۹ء میں "لختِ جگر"، ۱۹۸۳ء "خونِ جگر" اور ۱۹۹۰ء میں "دردِ جگر" پیش کیا۔ اور یہی ادبی اور فنی صلاحیتیں

کا لوہا منوایا۔ "انداز جگر" کے نام سے ان کا ایک شعری مجموعہ کچھ عرصہ پہلے دیوناگری لپی میں پیش کیا گیا ہے۔ اور اب محکمہ السنہ پنجاب ان کا ایک شعری مجموعہ گورمکھی لپی میں پیش کر رہا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ ادبی سفر جاری ہے۔ جگر صاحب غالباً ہندوستان کے پہلے اردو شاعر ہیں جن کا کلام اردو یعنی فارسی لپی کے ساتھ ساتھ دیوناگری اور گورمکھی لپی میں کتابی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ جگر صاحب کا طرۂ امتیاز ہے جو انہیں دوسرے تمام شاعروں کی قطار میں سربلند کرتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت کے آسمان کو چھونے والے اس جیالے شاعر کو اس کی قابلِ قدر تصانیف پر ایک درجن سے زیادہ ایوارڈ اور انعامات مل چکے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ کی طرف سے بہترین شاعر کا اعزاز اور انعام دیا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں انہیں جالندھر کی لائینز کلب اور جے سینز کی طرف سے منعقدہ اعزازی مشاعرہ میں کیسۂ زر سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۹ء میں روٹری کلب جالندھر کی طرف سے ان کے اعزاز میں مشاعرہ کیا گیا۔ اپریل ۱۹۸۰ء میں اہلِ پٹیالہ کی طرف سے جشنِ جگر کا اہتمام کر کے انہیں سرفراز کیا گیا۔ اس موقع پر سووینیر شائع کیا گیا اور کیسۂ زر دیا گیا۔ ۱۹۸۰ء میں جگر صاحب کے دوسرے مجموعۂ کلام "لختِ جگر" پر انہیں اتر پردیش سرکار (اردو اکادمی) نے ایوارڈ دیا۔ ۱۹۸۱ء میں "لختِ جگر" پر پنجاب سرکار (محکمہ السنہ) کی طرف سے بہترین شعری تخلیق کا ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں روٹری کلب جالندھر اور پٹیالہ نے ان کی شاعرانہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں ایوارڈ دیے۔ روٹری کلب راجپورہ کی طرف سے بھی انہیں ایوارڈ دیا گیا۔ ان سب کے علاوہ ۱۹۸۹ء میں راشٹر پتی گیانی ذیل سنگھ کی طرف سے اعزاز دیا گیا اور پنجاب سرکار محکمہ السنہ کی طرف سے انہیں ۹۱-۱۹۹۰ء کا شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ دیا گیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے بتایا ہے۔ جگرؔ صاحب کو یہ ایوارڈ۔ یہ انعام و اکرام یہ شہرت مقبولیت سالہا سال کی عرق ریزی کے بعد ملی ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے بڑے بڑے سینئر شعراء کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کی شاعری پر ان کے دادا استاد حضرت جوشؔ ملسیانی استاذی مکرم حضرت ساحرؔ سیالکوٹی کے علاوہ جناب رتن پنڈوروی۔ جناب خمارؔ بارہ بنکوی جناب بشیر بدر۔ جناب ساحرؔ ہوشیارپوری اور جناب قیسؔ جالندھری اور دیگر کئی صاحبان نے اظہار رائے کرتے ہوئے انہیں فراخدلی سے داد دی ہے۔

خاندانِ جوشؔ کے معنوی چشم و چراغ جگرؔ جالندھری صاحب بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور انہوں نے گلستانِ غزل میں شعروں کی صورت میں ایسے ایسے عطر بیز پھول کھلائے ہیں۔ جن کی خوشبو نے دور دور تک صاحبانِ ذوق کو اپنا گرویدہ اور شیدا بنایا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ جگرؔ صاحب غزل کے ساتھ ساتھ نظم۔ رباعی۔ قطعہ اور دیگر اصنافِ سخن پر پورے طور سے حاوی ہیں۔ لختِ جگرؔ اور دردِ جگرؔ میں انکی بہت پیاری نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔

آخر میں صرف یہی کہنا چاہتا ہوں کہ شاعری میں مستقبل جگرؔ صاحب کا ہے۔ حال پر وہ پہلے ہی حاوی ہو چکے ہیں۔ اس لیے یہ پیش گوئی پوری ذمہ داری کے ساتھ کی جا سکتی ہے کہ اکیسویں ۲۱ویں صدی کی آمد سے پہلے پہلے جگرؔ صاحب کی شہرت اور مقبولیت ہندوستان کی سرحدوں کو پھلانگ کر دنیا کے دوسرے ملکوں تک پہنچ جائے گی۔

ہِمّت رائے شرما

مایۂ ناز شاعر

جنابِ جگرؔ جالندھری

جناب جگرؔ جالندھری صاحب اِس وقت سرزمینِ پنجاب کے ایک مایۂ ناز شاعر ہیں۔ ایک عظیم شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ شخصیت جو پُرکشش بھی ہے اور دلنواز بھی۔ وہ بُلند نظر اور صاحبِ وجد و حال ہیں۔ ایک باکمال اور صائب الرائے ادیب مسلّم الثبوت اور اعلیٰ پائے کے شاعر، روشن خیال مصلح ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ بی۔ اے۔ ایل ایل بی و ادیب فاضل ہوتے ہوئے کُھلے ذہن کے مالک ہیں۔ علم و ادب سے گہری وابستگی ہے۔ فنِ شعر پر حاکمانہ نظر رکھتے ہیں۔ جگرؔ صاحب بُنیادی طور پر غزل گو ہیں۔ غزل کے مزاج کو پہچانتے ہیں اُنکی غزلوں میں سادگی۔ الفاظ کی بندش۔ حسنِ بیان۔ سلاست اور روانی سے اُستادانہ رنگ نُمایاں ہے عربی، فارسی کے مروّجہ الفاظ بڑی خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ خود ادیب فاضل ہیں۔ ایک سُلجھے ہوئے صاحبِ طرز اور باشعور شاعر ہوتے ہوئے مزاجاً بہت ہی مخلص بڑے نیک۔ وضعدار اور نہایت شریف انسان ہیں جو اس دور میں ملنے مشکل ہیں۔

جگر صاحب جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں: ؎

جگر اچھا ہے یوں تو شاعر بھی
آدمی باکمال ہے پیارے

ان کے اشعار میں عمق بھی ہے۔ پاکیزگی بھی۔ خیالات کی جدّت۔ ندرتِ معانی کی سنجیدگی و متانت طبیعت میں ایک عجیب احساس پیدا کردیتی ہے۔

جگر صاحب مشاہیرِ فن کے اس سلسلے کی کڑی ہیں۔ جس میں استاد داغ کے بعد ابوالفصاحت جناب جوش ملسیانی۔ عرش ملسیانی صاحب۔ سحر البیان جناب ساحر سیالکوٹی کے نام شامل ہیں۔ وہ داغ کی فروزاں کی ہوئی شمع کو روشن رکھے ہوئے ہیں اور اسی لیے اپنے اشعار میں ہمیشہ فصحائے زبان و ماہرانِ زبان کی طرح شستہ روزمرّے کو اور سلاست و روانی کو تکلّف اور تصنّع پر ہمیشہ ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں ہر قسم کے مذاق کے نمونے شامل ہیں۔ جیسے سوز۔ مزاح۔ تصوّر۔ بیان۔ اخلاق۔ فلسفہ وغیرہ۔ ان کے کلام میں حقانی یعنی ویدانت اور تصوّف کی شاعری بھی پائی جاتی ہے۔ ہر شاعر کا اپنا اپنا رنگ ہوتا ہے۔ جس سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ طرزِ احساس ہر شاعر کا جُدا ہوتا ہے طرزِ احساس کے اسی انوکھے پن پر فنکارانہ انفرادیت اور شاعرانہ امتیاز کی بنیاد قایم ہوتی ہے۔ طرزِ فکر ادبی تخلیق کی بنیادی شرط ہے۔ ایک اچھا شاعر وہی ہے جو تخلیقی شعور رکھتا ہو۔ اور ایک باشعور اور سلجھا ہوا شاعر وہی ہے جو شاعری کے مختلف انداز و اسالیب اور فنی رموز سے واقفیت رکھتا ہو۔ اصنافِ سخن سے آشنا ہو کیونکہ شاعری ایک فن ہے، مکمل فن اور جگر صاحب کو تمام اصنافِ سخن پر مساوی قدرت حاصل ہے۔

ان کے کلام کے کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیں: ؎

کب وہ رُکتے ہیں کسی منزل پہ ؛ جن کو چلنے میں مزا آتا ہے

مسکراتا ہے تو ستا کے مجھے
میں ستاؤں گا مسکرا کے تجھے

٭

ہم نے کتنے پہاڑ کاٹے ہیں
اک تمنا کی مورتی کے لیے

٭

کیا کرشمے تھے رہنماؤں میں
لوگ بیٹھے گئے خداؤں میں

٭

کوئی غم ہے نہ شادمانی ہے
کتنی بے کیف زندگانی ہے

٭

دونوں ہاتھوں سے لوٹتی ہے ہمیں
کتنی ظالم ہے تیری انگڑائی

٭

عشق کا اک گناہ کر کے جگرؔ!
بچ گئے ہم کئی گناہوں سے

٭

خفا موت ہو۔ زندگی روٹھ جائے
کسی پر کبھی وقت ایسا نہ آئے

صبر کر صبر ۔ اے دِلِ ناداں !
جب سے ہے چند روز کا مہماں

٭

ہم سائے اب اِتنا بھی گوارا نہیں کرتے
مِل جائے جو دیوار سے دیوار کا سایہ

٭

حسرتوں کا ہو گیا ہے اس قدر دِل میں ہجوم
سانس رستہ ڈھونڈتی ہے آنے جانے کے لیے

٭

غیر بیچا خود بخود ہو جائے گا
خود کو پہلے اُس سے اونچا کیجیے

٭

پھولوں سے پتھروں کا دیا کرتے ہیں جواب
اپنا چلن ہے شاخِ ثمردار کی طرح

٭

میں سمجھتا ہوں کسی لطیف جذبے کو منظوم پیرائے میں بیان کرنا شاعری ہے۔ بلکہ
[شا]عری کے بارے میں کسی نے خوب کہا ہے کہ دُنیائے خارجی میں جو نظارے نظر سے گزرتے
[ہیں] اور دُنیائے داخلی میں جو کیفیات دِل محسوس کرتا ہے اُنہیں موزوں الفاظ کے سانچے
[میں] ڈھالا جائے کہ جو اثر خود شاعر کے دِل پر ہوا ہے وُہی قاری کی طبیعت پر ہو۔
[شا]عری۔ نقاشی۔ بُت تراشی۔ موسیقی وغیرہ سب ایک ہی قسم کے فنون ہیں یعنی فنونِ لطیفہ۔

لیکن شاعری مسلّمہ طور پر فنون لطیفہ کی تقسیم چہار گانہ میں سب سے بلند تر ہے کیونکہ شاعری بقیہ اصناف کی جامع محاسن ہے۔ شاعری میں جتنا شاعر اس باب میں کامیاب ہوتا ہے کہ جو کیفیت اس نے خود محسوس کی ہے وہی دوسروں کو کرا دے تو یہ اسکا کمال ہے۔ البتہ یہ امر مسلّم ہے کہ شاعر کا اپنا احساس اور اس احساس کا اظہار ایک طرف تو احساس و اظہار عامہ سے ممیز و ممتاز ہونا چاہیے تو دوسری طرف اور شعراء کے احساس و اظہار سے ـــــــــ چناں چہ شاعری اشیائے خارجی و داخلی کی تصویر کشی ہے یعنی شاعری ایک نہایت با وقعت اور سنجیدہ جذبۂ انسانی ہے ـــ مگر عشق ـــ عشق ایک متبرک جذبہ ہے ـــ عشق الٰہی سے پاک تر اور کون سا جذبۂ انسانی ہے؟ اور ـــ عاشقوں کے کلام سے پاک تر اور کون سا کلام ہے ـــ؟ عشق۔ فلسفہ ویدانت یا تصوف وحدت وجود کی تعلیم دیتا ہے یعنی ایک ہستی عین نور و عین سرور ہے باقی ہر شے کی ہستی محض اضافی یعنی نمودی ہے۔ واقعی نہیں ـــــــ جناب جگر صاحب نے لفظ "عشق" کو جس طرح اپنی معرکۃ آلارا نظم "عشق" میں استعمال کیا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ اس موضوع پر ایسی بے مثال نظم آج تک میری نظر سے نہیں گزری۔

میں نے ان کا کلام نظرِ تعمّق سے بھی دیکھا ہے اور نگاہِ تلطف سے بھی۔ اُردو پر اپنی غیر معمولی گرفت کے باعث اپنے شعروں میں قدم قدم پر قلم کی جولانیاں دکھاتے ہیں یعنی ان کے اشعار سے اُردو زبان پر ان کی بے پناہ دسترس کا پتہ چلتا ہے۔

اُن کے کلام میں چونکہ اشعار باہم مربوط ہوتے ہیں اس لیے غزل کا ہر شعر بذاتِ خود ایک مکمل نظم ہوتا ہے اُن کی کچھ نظمیں بے مثال ہیں جن کا ایک ایک حرف کمالِ شاعری کا دلکش ترین نمونہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ نظموں کا خالق ایک اخلاقی ولولہ سے سرشار ہے۔ ہر نظم بلندیٔ خیال۔ تراکیب شکوہ الفاظ۔ جوشِ بیان اور ندرتِ ادا کا ایک خوبصورت ترین مرقع ہے۔

جناب دھرم پال جگر جالندھری صاحب ایک خوش فکر۔ خوش کلام۔ خوش مزاج۔ خوش اطوار۔ خوش رو اور خوش پوش۔ خوش خلق سخنور ہوتے ہوئے داد و ستائش سے بے نیاز اور بڑے ہی شریف انسان ہیں۔ ہمدردی اور انسان دوستی ـــــ انکی شخصیت کا ایک روشن ترین پہلو ہے۔ بڑے وسیع القلب انسان ہیں۔ کلمۂ حق کہنے سے ذرا بھی نہیں چوکتے۔ اُن کے اشعار ان کی حق گوئی اور بے باکی کا بیّن ثبوت ہیں۔ اردو کی بقا اور ترقی کے لیے ہمیشہ سرگرم رہتے ہیں ـــــ ان کی اردو ادب کی گراں مایہ خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے حکومتِ پنجاب کے محکمہ لسانیات نے آپ کو شرومنی اردو ساہتیہ کار کے امتیازی ایوارڈ سے نوازا ہے جس کے آپ بجا طور پر مستحق ہیں۔

اِس دُعا کے ساتھ کہ ؎

"تیرا کمال بڑھے عمرِ جاوداں کی طرح"

میں اپنے عزیز مکرم جناب جگر جالندھری صاحب کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

سُکھدیو شرما رشکؔ

عکسِ جگر

اُردو زبان و ادب کا گہرائی سے مطالعہ کیا جائے۔ تو یہ بات اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ اُردو کی نشوونما میں سرزمینِ پنجاب کے اُدبا اور شعراء کا ایک قابلِ قدر حصّہ رہا ہے۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ اگر اس حصّہ کو نظر انداز کر دیا جائے تو اُردو کی مجموعی تصویر اپاہج ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اپنی مادری زبان پنجابی کے بعد اُردو ہی وہ دُوسری زبان ہے جس میں قبل از تقسیمِ وطن یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے بغیر کسی ترغیب و تحریک کے اس زبان کو اپنا وسیلۂ اظہار بنایا۔ تقسیمِ وطن کے بعد اگرچہ اُردو کے ساتھ ساتھ ہندی بھی قدم سے قدم ملانے لگی بلکہ اُردو سے دو قدم آگے بھی نکل گئی لیکن اُردو سے عشق کرنے والوں کی محبت میں کہیں لغزش واقع نہیں ہوئی۔ اور دورِ حاضر میں بھی اُردو کی خدمت برابر ہو رہی ہے۔

گذشتہ تین دہائیوں میں سرزمینِ پنجاب سے اُردو شاعری میں جو نام دیکھنے میں

دیکھتے دیکھتے عوام کے من پسند نام بن گئے اور پنجاب کی حدوں سے باہر بھی احترام ہونے لگا'

ان میں جگر جالندھری کا نام سرِفہرست کہا جاسکتا ہے۔ جگر صاحب کے کلام کی مقبولیت

کا راز کیا ہے؟ اس بارے میں کسی رائے کا تعین کرنا مناسب نہیں۔ آپ کا کلام سنیں گے

یا پڑھیں گے تو خود بخود اس بات پر ایمان لائیں گے کہ کامیاب فن یا فنکار کسی کی

تعریف کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں بڑے انہماک اور غور و خوض کے بعد لکھتے

ہیں۔ جبھی تو اُن کا ہر شعر اپنے آپ میں ایک وسیع مضمون کا احاطہ اس خوبصورتی سے کرتا

ہے کہ اس میں مزید ردّ و بدل کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ شاعر جب اس منزل کو چھو لیتا

ہے تو اُسے بلاشبہ ماہرِ فن کہا جاسکتا ہے۔ میری ذاتی رائے ہے کہ شاید اسی مقام پر

پہنچنے کے بعد شاگرد کو فارغ الاصلاح قرار دیا جاسکتا ہے۔ جگر صاحب کو اُن کے اُستادِ محترم

قبلہ ساحر سیالکوٹی مرحوم نے اپنی حیات میں ہی فارغ الاصلاح کر دیا تھا۔

لیکن اپنے اُستاد کے تئیں ان کی سعادت مندی دیکھیے کہ آپ اُستادِ محترم کے

آخری دم تک انہیں اپنا کلام بغرضِ اصلاح بھیجتے رہے۔ میں نے خود دیکھا کہ کئی بار میں ان

کی غزل میں بغیر کوئی ترمیم یا تنسیخ کیے غزل واپس کر دیتے تھے۔ لیکن وہ غزل کبھی اُن کے

دستخط کے بغیر واپس نہیں جاتی تھی۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا۔ کہ قبلہ نے غزل بغور دیکھ

لی ہے اور اس میں اصلاح کی کوئی ضرورت نہیں۔ چونکہ جگر صاحب کا کلام محاسن سے

لبریز اور عیوب سے پاک صاف ستھرا ہوتا تھا۔ اسی لیے اکثر قبلہ خوش ہو کر غزل پر

دستخط کے علاوہ "آفرین" "غزل قابلِ ستائش ہے" "داد دیتا ہوں" یا اچھے شعر کے

سامنے "خوب" اور بہت اچھے شعر کے سامنے "بہت خوب" لکھ کر حوصلہ افزائی فرماتے

تھے۔ اُستادی شاگردی کی بات چل نکلی تو عرض کردوں کہ جگر صاحب نے ابتدا میں

حضرت جوش ملسیانی صاحب سے اصلاح لینی شروع کی تھی۔ لیکن بعد ازاں انہی کے

کہنے پر آپ نے جناب ساحرؔ سیالکوٹی صاحب کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ جن سے آپ برسوں فیض یاب ہوتے رہے۔

جگرؔ صاحب سے میری پہلی ملاقات بھی قبلہ ساحرؔ سیالکوٹی صاحب کے دولت کدہ واقع سنٹرل ٹاؤن جالندھر میں غالباً ۱۹۸۰ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت تک میں ان کا نام اور کلام تو سن چکا تھا۔ لیکن نیاز کا شرف وہیں حاصل ہوا۔ قبلہ ساحرؔ صاحب جس بیٹھک (دیوان خانہ) میں چارپائی پر بیٹھے رہتے تھے اور سامنے حُقّہ دھرا رہتا تھا یہ جگہ جالندھر اور آس پاس کے علاقوں کے شاعروں کے لیے ایک ادبی مرکز کی حیثیت رکھتی تھی۔ خصوصاً شام ہوتے ہی وہاں قبلہ کے شاگرد اور کچھ سامعین جمع ہو جاتے تھے۔ شعر و سخن کے چرچے ہوتے تھے۔ جن سے سخن ور اور سخن شناس دونوں فیض یاب ہوتے تھے۔ جگرؔ صاحب چونکہ پٹیالہ میں مقیم تھے۔ اس لیے یہ وہاں کبھی کبھی آتے تھے۔ لیکن جب یہ وہاں آجاتے تھے تو قبلہ ساحرؔ صاحب کی نگاہوں کا مرکز صرف جگرؔ صاحب بن جاتے تھے۔ جگرؔ صاحب بھی اپنے اُستادِ محترم کو بڑے ادب اور احترام سے ملتے تھے۔ اور ان کے ساتھ والہانہ محبّت کا تو یہ عالم تھا کہ جب تک جالندھر میں رہتے تھے قبلہ کی رہائش گاہ پر ہی قیام کرتے تھے۔

مکتبۂ جوشؔ ملسیانی سے نسبت ہونے کے سبب آپ کا حسب نسب مرزا داغؔ دہلوی مرحوم سے جا ملتا ہے۔ لہٰذا جگرؔ صاحب کے کلام میں داغؔ اسکول کی روایت اور پاسداری نظر آئے گی۔ آپ نے زبان کی صفائی و سلاست اور کلام میں فصاحت و بلاغت کا یکساں لحاظ رکھا ہے۔ روزمرّہ اور محاورہ کا استعمال جس خوبصورتی سے ان کے کلام میں ہوا ہے وہ انہی کا منفرد حصّہ ہے۔ معنی آفرینی اور حُسنِ بیان ان کے کلام میں بدرجۂ احسن موجود ہے۔ جہاں تک مضامین کے انتخاب کا تعلّق ہے۔ جگرؔ صاحب بڑے حسّاس طبیعت

نازک مزاج اور درد مند شاعر واقع ہوئے ہیں۔ سماجی، سیاسی، مذہبی، ثقافتی غرض ہر شعبے پر اُن کی نظر رہتی ہے اور مضمون کوئی بھی ہو اُس کو نیچرل انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ ان سے بہتر ہر شاعر کے حصّہ میں نہیں آیا۔ جبھی تو وہ جو کچھ کہتے ہیں دل میں اتر جاتا ہے اور پرائی بات بھی اپنی سی لگتی ہے۔ بلکہ دل کو لگ جاتی ہے۔ ان کے کلام میں بہت سے اشعار ایسے ہیں جو ضرب المثل بن چکے ہیں۔

جگر صاحب غزل اور نظم کے علاوہ دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کرتے رہے لیکن سچّی بات یہ ہے کہ غزل کی صنف ان کے فن کی معراج کہی جا سکتی ہے۔ یوں بھی اُن کے کلام کا تین چوتھائی حصّہ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہی غزل میں ملبوس ہے۔ سوزِ جگر، لختِ جگر، خونِ جگر، دردِ جگر اور ہندی مجموعہ اندازِ جگر ان کی مشہور تصنیفات ہیں۔ ان مجموعوں میں جگر صاحب کی فکری کاوشوں سے جو جواہر پارے وجود میں آئے وہ اُردو شاعری کا گراں قدر سرمایہ کہے جا سکتے ہیں۔

جہاں تک جگر صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے۔ اِس کے بارے میں صرف ایک جملہ بھی کافی ہے اور شاید ایک ضخیم کتاب بھی ناکافی۔ صرف اتنا عرض کروں گا۔ کہ ایسی ہستیاں فی زمانہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ نہایت پرہیزگار، قناعت پسند، صاف اور سچّے خلوص و محبّت کا پیکر، نفاست پسند اور اعلیٰ انسانی قدروں کے آئینہ دار، خوش لباس، خوش مزاج و خوش گفتار۔ اِن سے ایک مختصر ملاقات بھی برسوں کے لیے اپنا تاثر چھوڑ جاتی ہے۔ اِن سے ملنے کا دوسرے لفظوں میں مطلب ہے کسی پھول سے مخاطب ہونا۔ جس کی خوبصورتی اور خوشبو دونوں سے آدمی سرشار ہو جاتا ہے۔ ریڈیو۔ دوردرشن۔ اور پبلک مشاعروں میں اُنکی شرکت کامیابی کی ضمانت سمجھی جاتی ہے۔ ادبی رُجحانِ طبیعت کا تو یہ عالم ہے کہ

اپنی جائے رہائش پر بھی شعراء کو جمع کر لیتے ہیں۔ اور مہمانوں سے زیادہ اُنکی خاطر مدارات میں اپنے علاوہ اپنی اہلیہ محترمہ اور عزیزان کو بھی زحمت دینے سے گریز نہیں کرتے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ بھگوان نے انہیں ایک خوش مزاج، نیک سیرت اور سلیقہ شعار رفیقۂ حیات سے نوازا ہے جو خود بھی مذاقِ سلیم رکھتی ہیں۔ اور ایک اچھی سخن شناس ہیں۔ اپنے شوہر نامدار کی کامیابیوں اور کامرانیوں میں ان کا رول بھی ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

پنجاب گورنمنٹ کے محکمہ السنہ کی طرف سے شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ، جو امسال جگر صاحب کو شاعری کے توسط سے اُردو ادب کی خدمت کے سلسلے میں دیا گیا ہے، اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ محکمہ نے ایک مستحق شاعر کا انتخاب کیا ہے۔ جس کے لیے اہلِ قلم محکمہ السنہ پنجاب کو بھی مبارک باد دیتے ہیں۔ ●

گُل و خار

اِدھر ایک پل ہے ہجومِ مسرّت
اُدھر ایک پل غم کا عالم ہے پیارے
زمانہ جسے زندگی کہہ رہا ہے
گُل و خار کا ایک سنگم ہے پیارے

(جگر جالندھری)

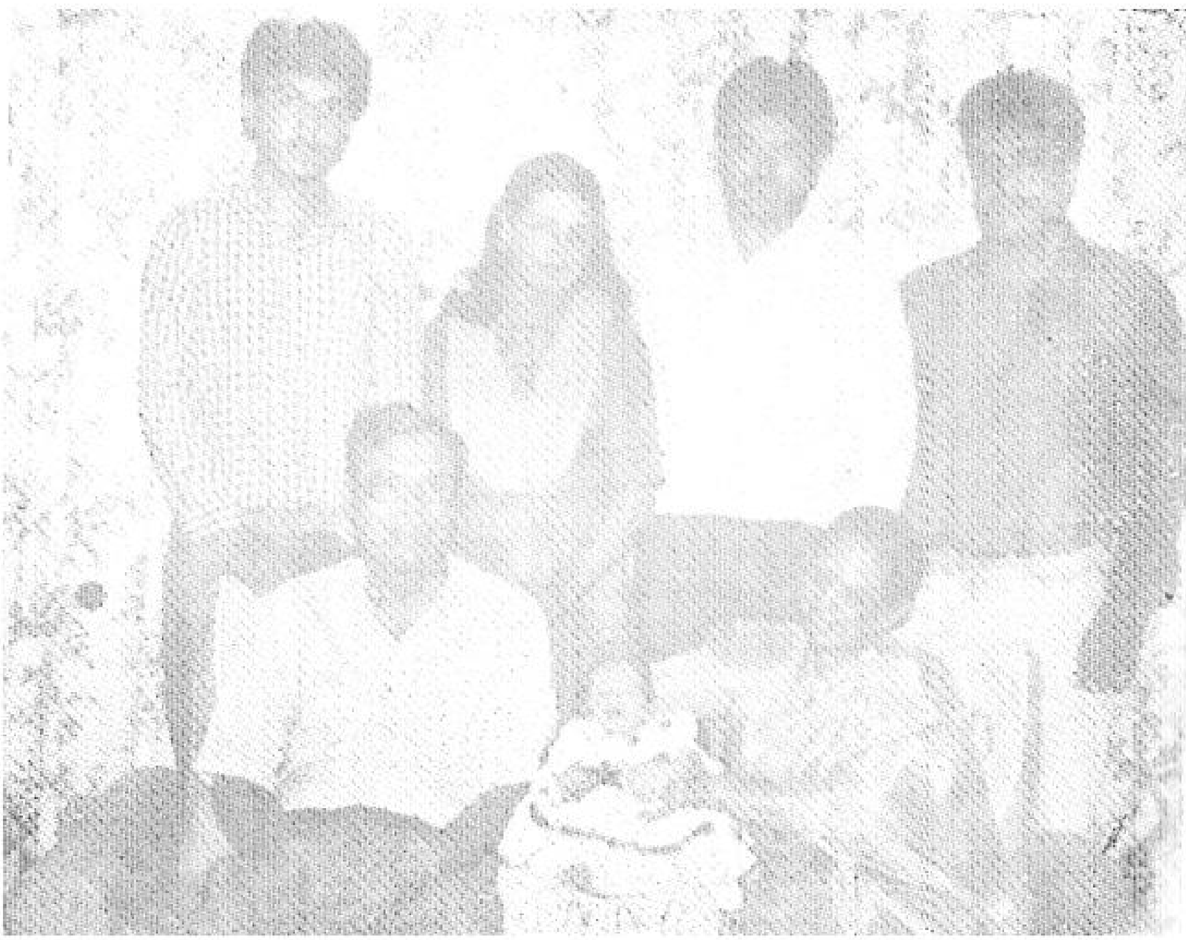

جناب جگر جالندھری اپنی اہلیہ شریمتی کملا، بیٹے دنیش، انل، راجیش، بہو مونیکا اور پوتی پورنما کے ساتھ

یوں خوشی سے کٹ رہی ہے زندگانی

جناب جگر جالندھری عظیم المرتبت اساتذہ پدم شری قبلہ جوش ملسیانی اور سحر البیان جناب ساحر سیالکوٹی کے ساتھ
ہے اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

یوم آزادی کے موقع پر گورنر پنجاب عالی جناب سر چندر ناتھ، جناب جگر جالندھری کو پنجاب سرکار کے "پرمان پتر" سے سنمانت کرتے ہوئے

اہلِ پٹیالہ کی جانب سے منعقدہ کل ہند مشاعرے میں جناب سریندر کپور وزیر ریاست برائے محکمہ تعلقاتِ عامہ پنجاب
و دیہہ آبپاشی و بجلی جناب جگر جالندھری کا اعزاز کرتے ہوئے۔ تصویر میں انجینئر ایچ۔ ایس۔ بوبجہ چیئرمین پنجاب راج
بجلی بورڈ بھی نمایاں ہیں۔

آر۔ ڈی۔ شرما تاثیر

پنجاب کے نمائندہ اردو شاعر
جنابِ جگر جالندھری

❀

جناب جگر جالندھری کو پنجاب کے شاعروں میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ شاہنیہ شرومنی جو پنجاب سرکار کا سب سے بڑا انعام ہے سے جگر صاحب کو سرفراز کر کے سرکار نے بھی اس پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی ہے۔ انعامات و اکرامات و اعزازات سے جناب جگر جالندھری کا دامن مالامال ہے۔ لیکن کسی شاعر کو پرکھنے کا یہ ایک پیمانہ تو ہے لیکن صرف یہی پیمانہ کافی نہیں ہر چند کہ جگر صاحب کے معاملے میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ انعامات و اعزازات کے وہ مکمل طور پر حقدار ہیں اس قدر افزائی کے وہ مستحق تھے انگریزی میں کہیں تو یہ سب کچھ deserved Recognition ہے۔ یہ کامیابی و کامرانی لائقِ ستائش ہے کیونکہ اس طرح کی سے شاعر و ادیب کو اور اچھا کہنے کی ترغیب و تحریک ملتی ہے جگر صاحب نے یہ کامیابی لمبی ریاضت و خاموش مگر ٹھوس ادبی خدمات کے عوض حاصل کی ہے۔

جگرؔ صاحب کی شاعری و شخصیت سے متعلق یہ مضمون لکھنا شروع کیا ہے تو یہ مشکل آپڑی ہے یہ سوال سامنے آکھڑا ہوا ہے کہ میں جگرؔ صاحب کی شخصیت و شاعری میں سے کسے فوقیت دوں لیکن ذرا سا سنجیدگی سے سوچا جائے تو یہ مسئلہ آپ ہی آپ حل ہوگیا ہے جگرؔ کی شخصیت اور اُس کی شاعری دونوں ہم آہنگ ہیں مکمل طور پر جگرؔ کی نجی زندگی میں جو اعلیٰ صفات ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں ان کی محبت شائستگی خوش سلیقگی، متانت، قول و فعل میں ایک دل پذیر نفاست سب اوصاف اُنکے اشعار میں بھی جلوہ فگن ہیں اُن کی شاعری اُن کی شخصیت ہی کا عکس ہے اور یہ بے حد اہم بات ہے۔ وگرنہ اکثر و بیشتر شعراء و ادیب عملی زندگی میں اپنی تحریروں میں کہیں دُور بھی نظر نہیں آتے۔ دُوسروں کو زندگی جینے کا شعور و بصیرت دینے کے دعویدار یہ لوگ اپنی نجی زندگی میں عام طور پر بھٹکے ہوئے مسافر نظر آتے ہیں اکثر و بیشتر ایسے لوگوں کو مل کر اُن سے متعلق ایک طلسم ٹوٹ سا جاتا ہے آپ کو ایک دِل برداشتگی کا احساس بھی ہوتا ہے آپ کے اندر سے آواز آتی ہے کاش ہم اُن مہان لوگوں سے نہ ملے ہوتے۔ ہمارا اُن کا واسطہ اُن کے ادب تک ہی محدود رہتا۔ اِس کے برعکس جناب جگرؔ جالندھری سے مل کر آپ کے دِل میں اُن کے تئیں گرویدگی و پسندیدگی کے جذبات کو تقویت ملتی ہے۔ یہ توازن قایم رکھنا بہت مشکل کام ہے۔ لیکن جگرؔ کے ہاں یہ معجزہ مجسّم ہوکر سامنے آتا ہے کہ فن اور فن کار کے بیچ کوئی فاصلہ یا کوئی تضاد دکھائی نہیں دیتا۔ میرے اس تاثّر کی تردید جگرؔ کے بارے میں لکھنے والے بے شمار دانشوروں نے کی ہے۔ اِس سلسلے میں جگرؔ صاحب کے ہم عصر پنجاب کے دو شعراء حضرات کی آراء کا مختصر حوالہ دے رہا ہوں کہ ان دو اصحاب کے تجزیے میں مجھے سچّائی کی جھلک کہیں زیادہ نظر آئی ہے کم سے کم ان لوگوں کی باتوں میں رسم،

نبھانے کا رویّہ نہیں ہے یہ انہیں جگرؔ کی بے جا تعریف سے کوئی مطلب ہے۔
ملاحظہ فرمایئے جناب آزادؔ گلاٹی کے تجزیے کا ایک مختصر ترین اقتباس:

"جگرؔ جالندھری کی شاعری اُن کی شخصیت کا خلوص نامہ ہے وُہی شائستگی وُہی ٹھہراؤ وُہی نظم و ضبط وُہی خود داری شرافت جو اُن کی شخصیت کا خاصہ ہیں اُن کی شاعری کی شناخت بھی بن گئی ہیں۔ اُن کی شخصیت کی منجملہ صفات کو اُن کا یہ شعر پورے شاعرانہ خلوص کے ساتھ بیان کرتا ہے:

پھولوں سے پتھروں کا دیا کرتے ہیں جواب
اپنا چلن ہے شاخِ ثمر دار کی طرح

اور یہ شاخِ ثمر دار اُن کی شخصیت سے نمو حاصل کر کے اُن کے فن تک پھیلتی پھولتی چلی گئی ہے۔"

جناب پریم کمار نظرؔ کی صاف گوئی سے کسے انکار ہے جنابِ جگرؔ کے متعلق اُن کا تبصرہ اِسی لیے خاص توجّہ کا حاصل ہے:

"آج جگرؔ پنجاب کے اُن گنے چنے شعرا میں شمار ہوتے ہیں جن کے ہاتھ میں اُردو غزل کا مستقبل محفوظ سمجھا جانے لگا ہے...... اور اُنکی شخصیت و شاعری کے موازنے میں اُنھوں نے ایک فقرے میں مکمل صورتِ حال بیان کر دی گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے:

"بطورِ انسان جگرؔ جالندھری اپنی شاعری سے کہیں آگے ہیں"

یوں تو جگرؔ صاحب کے متعلق بہت لوگوں نے لکھا ہے ملک بھر کے سر برآوردہ شاعروں ادیبوں کی طویل فہرست ہے پھر بھی کچھ نام درج کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو کہ جگرؔ کی شخصیت و شاعری

اب ہمہ گیر شہرت کی حامل ہو چکی ہے۔

جگر صاحب سے متعلق لکھنے والوں میں قبلہ و کعبہ جوش ملسیانی مرحوم جگر کے اُستادِ محترم جناب ساحر سیالکوٹی۔ جناب امر چند قیس۔ جناب ساحر ہوشیارپوری صاحب۔ جناب اُدے سنگھ شاد جناب عرش ملسیانی۔ جناب شماہر ناوی۔ جناب وفا پٹیالوی۔ جناب گنپت رائے سری واستو الہ آباد یونیورسٹی۔ جناب مولانا ابر احسنی، جناب کپور سنگھ گھمن۔ جناب خمار بارہ بنکوی اور ڈاکٹر بشیر بدر جیسے چوٹی کے شاعر و ادیب شامل ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتا، جگر صاحب سے میرا جو رشتہ ہے (وہ میرے گرو بھائی ہیں) وہ بھی مانع ہے اور قبلہ و کعبہ جوش ملسیانی صاحب کی تنبیہ بھی بار بار یاد آ رہی ہے۔

بدگمانی کی بھی عادت ہے زمانے کو بہت
تجھ کو اچھا نہ کہیں گے تو یہ اچھا ہوگا

جناب جگر جالندھری کی شاعری کے بارے میں میں بھی حسبِ توفیق اپنی بات دلیل سے کہنے کی کوشش کروں گا کہ آخر کار جگر کی شاعری میں کیا کشش ہے کیا کرامات ہے جو مجھے اس درجہ متاثر کرتی ہے ہر چند کہ یہ کام بہت مشکل ہے آپ کس شعر سے متاثر ہوتے ہیں لیکن آپ نے اس شعر سے جو حظ اٹھایا ہے وہ احساس بڑی ہی ذاتی نوعیت کا بڑا ہی لطیف ہوتا ہے کہ اکثر و بیشتر اس کی صراحت لفظوں کی استطاعت سے ماورا ہوتی ہے۔ اعلیٰ شاعری آپ کو بے خودی کے عالم سے روشناس کرواتی ہے ایک ایسا تجربہ جسے کبیر جی نے گونگے کے گڑ کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔ کہ گونگا آدمی کیا بتائے جس شعر میں یہ گہرائی و گیرائی ہوگی کہ آپ کو دم بخود کر دے وہی اعلیٰ شعر ہوگا لیکن اس حالت میں کلیتاً آپ اس احساس کو

الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکیں بہر حال اور راستہ بھی کوئی نہیں۔ جگر صاحب کے بارے میں یہ متفقہ رائے ہے کہ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ میں خود اس رائے سے اتفاق کرتا ہوں لیکن جگر صاحب کی نظموں / قطعات تضمینات وغیرہ کی اہمیت کم نہیں یہ ٹھیک ہے کہ جگر صاحب کی نظموں پر بھی اُن کی غزل کا رنگ حاوی ہے لیکن ہیئت کے اعتبار سے اور یہ کوئی عیب بھی نہیں بلکہ اکثر و بیشتر یہ بات مستحق ہی ہے کہ نظمیہ شاعری کے پس پُشت چلے جانے کی اور وجوہات بھی ہیں لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ نظمیہ شاعری خاص طور پر غیر پابند شاعری کو Quote نہیں کر سکتے بات پڑھنے تک رہ جاتی ہے آپ کی بات چیت میں رچنے بسنے کا اُسے موقع بیشتر نہیں آتا مشاعروں میں نظموں سے اگر لوگ متاثر بھی ہوتے ہیں تو لمحاتی طور پر کیوں کہ اکثر بیشتر ایک کھائی ایک communication gap باقی رہ جاتا ہے جبکہ غزلیہ شاعری اور نظمیہ شاعری (پابند) دونوں میں زبان زدِ عام ہونے کی صلاحیت ہے۔ آیئے جگر صاحب کی شاعری کے توسط سے جگر صاحب کی فنکارانہ صفات سے لطف اٹھائیں اور اُس جگر سے بھی ملنے کی سعادت حاصل کریں جو جگر اصل میں ہے سب سے پہلے غزل کے اشعار (چنیدہ اشعار) مختصر تبصرے کے ساتھ پیشِ خدمت ہیں:

جگر صاحب حُسن و عشق کے شاعر ہیں اُن کے مندرجہ ذیل اشعار کی ارضیت انہیں بلند مقام عطا کرتی ہے۔

تیرے بدن کی مہک ہے تیرے بدن کی مہک
چمن میں لاکھ مہکتے گُلاب دیکھے ہیں

سو بہاروں سے بھی پھول اتنے نہ کھلنے پائیں
جتنے اِک جُنبشِ لب سے وہ کھلا دیتے ہیں

٭

جگؔر صاحب کی ایک غزل میں 'کنارے' قافیہ کا استعمال تین بار ہُوا ہے اور تینوں بار مختلف مفہوم ادا ہُوئے ہیں ملاحظہ فرمایئں : ؎

تُو اگر پیاسا ہے دریا سے نہ لے پانی کی بُوند
اپنی خودداری کو قایم رکھ کنارے کی طرح

٭

سو سمندر بھی اُسے سیراب نہیں کر سکتے
پیاس جو اپنی بڑھاتا ہے کنارے کی طرح

٭

اور آخر میں

سامنے میرے تمہارے حُسن کا دریا رہے
اور میں دیکھا کروں تم کو کنارے کی طرح

٭

میری ناچیز رائے میں کسی شاعر کی قادرالکلامی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا، سُبحان اللہ !! اُردو شاعری میں تصوّف کا رنگ بہت گہرا ہے اور قدیم بھی صوفیانہ/ ویدانت کے خیالات کا اظہار بار بار ہُوا ہے اور ہوتا رہے گا دیکھیے جگؔر صاحب کتنے بڑے مسئلے کو کتنے فن کارانہ انداز میں مندرجہ ذیل شعر میں سمو دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ ؎

حجابِ یار اُٹھے گا، میں جب دُنیا سے اُٹھوں گا
مجھے معلوم ہے میں خود ہی اُس کے رُخ کا پردا ہوں

٭

ضروری تو نہیں، بڑی پامال ردیف ہے نہ جانے کتنی غزلیں اِس ردیف میں کہی گئی ہیں مگر شاعر کی انفرادیت کا معجزہ دیکھیے کہ کہیں غرابت کا شائبہ تک نہیں جِگرؔ صاحب کی اس ردیف کی غزل کا ایک ایک شعر قابلِ توجّہ قابلِ ستائیش ہے یہاں صرف مقطع دیا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ جِگرؔ صاحب نے اس پامال ردیف میں کس پائے کے اشعار کہے ہیں اور ردیف کو کس چابکدستی سے برتا ہے۔ ؎

خونِ دِل سے بھی تو ہو سکتی ہیں سُرخ آنکھیں جِگرؔ
ہم نے ساغر ہی پیے ہوں یہ ضروری تو نہیں

٭

رمزیت غزل کے شعر کی رُوح ہے شعریت کا انحصار زیادہ تر اسی وصف خاص پر ہے، دیکھیے جِگرؔ صاحب کا ایک مطلع سہل ممتنع رنگ سادہ سے الفاظ لیکن سوچیے تو سوچتے ہی جائیے۔ ؎

کس کا لب پر مِرے فسانہ ہے
ہمہ تن گوش اِک زمانہ ہے

٭

جِگرؔ صاحب نے اپنے مندرجہ ذیل شعر میں کس طرح دورِ حاضر کی ایک روش کو بے نقاب کیا ہے لیکن شاعرانہ انداز میں جِگرؔ کو اِس بات کا کس قدر افسوس ہے کہ ؎

حسد دوست سے دوست کرنے لگے ہیں
یہ سانپ آستینوں میں پلنے لگا ہے

٭

جِگرؔ کی شاعری (غزلیہ شاعری) کی مندرجہ بالا مثالوں سے یہ اندازہ لگانا غلط ہو گا

کہ جگؔر آج کے حالات سے بے نیاز ہے ہرگز نہیں۔ جگؔر کو پنجاب سے والہانہ پیار ہے لہٰذا وہ پنجاب کی بپتا کو بہت محسوس کرتا ہے اور اکثر اِس کا اظہار غزلوں میں کرتا ہے بالواسطہ کیوں کہ غزل کا انداز ہی یہ ہے۔ ؎

پڑ گئی ہیں دِلوں میں دراڑیں کئی
کیسا آیا ہے یہ زلزلہ دیکھنا

اور ؎
جس طریقے سے سُلجھا رہے ہو اسے
اور اُلجھے گا یہ مسئلہ دیکھنا

پنجاب کے المیے کے یہ دو پہلو ایک مکمل کہانی بیان کر دیتے ہیں۔

اب جگؔر صاحب کی نظموں کے بارے میں کچھ کہا جائے جیسا کہ اُوپر عرض کیا ہے اُن کی نظمیں اُن کی غزلوں کی توسیع کرتی ہیں کیوں کہ یہاں بھی وُہی پابندیاں اِس وہی دو مصرعوں کا مربوط ہونا لازم ہے لیکن جگؔر کی اکثر نظموں میں یہ پابندی ایک دو دان ہی ثابت ہوئی ہے اُن کے دیوان بہ موسومہ "لختِ جگؔر" میں "کلغی والا" کے عنوان سے جو نظم شاملِ اشاعت ہے۔ وہ جگؔر صاحب کی دسویں گُورو کے چرنوں میں اظہارِ عقیدت کی مثال ہے۔ جگؔر صاحب کے اُستاد جوشؔ ملسیانی صاحب کی ایک معرکتہ الآرا نظم بھی اِسی عنوان کی موجود ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں۔ ؎

آج کچھ طُرہ مضموں کی دکھائی ہے پھبن
کلغی والا مرا عنوانِ بیاں ہو جائے

"طُرہ" اور "کلغی" واہ وا! اِس مُناسبت پر قُربان جائیے۔

جگؔر صاحب نے بھی موضوع سے مکمل انصاف کیا ہے۔ غزل کا شاعر جب نظم کہتا ہے تو اُس کا انداز کیسا ہوتا ہے۔

س

جتنے افسانے تھے اُس دور میں جاں بازی کے
سارے افسانوں کا عُنوان تھا کلغی والا
کلغی والے کے غُلاموں کے بھی سُلطان تھے غُلام
اور سُلطانوں کا سُلطان تھا کلغی والا

اس نظم میں شروع سے آخر تک یہ شان برقرار رہتی ہے۔ یہاں قافیہ بھی ہے ردیف بھی!

ایک مثال جگرؔ صاحب کے حالیہ دیوان "دردِ جگرؔ" سے ملاحظہ فرمائیں۔ "ہندی سپاہی" نام کی نظم کا یہ بند دیکھیے۔ س

تیغ آندھی کی طرح رن میں اُٹھا کرتا ہے تُو
دشمنوں کے ٹکڑے ٹکڑے جابجا کرتا ہے تُو
موجِ دریا کی طرح ہر شے چلا کرتا ہے تُو
وقت کی مانند آگے ہی بڑھا کرتا ہے تُو

آخری مصرع کی داد کن الفاظ میں دی جائے۔ سُبحان اللہ! سُبحان اللہ!! اسی طرح "زندگی" کے عنوان سے کہی گئی نظم میں زندگی کے متنوع رنگ کس خوبی سے اُجاگر ہوئے ہیں کہ نظم سانس لیتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ ایک بند پیشِ خدمت ہے۔

س

اِک دُلہن کی بھی شوخیاں اس میں
ایک بیوہ کی بھی فُغاں اس میں
ہچکیوں کی بھی داستاں اس میں
آنسوؤں کا بھی کارواں اس میں

جگر صاحب نے کافی تعداد میں اعلیٰ پایہ کے قطعات کی تخلیق کی ہے۔ دو قطعات دے کر ان کی اس صنف میں مہارت کا ثبوت فراہم کیا جاتا ہے۔

ان کی جانوں میں ہے کیسی اک گھٹن
پھر بھی کتنے اداس ہیں یہ لوگ
ان کی تسکیں ہو نہیں سکتی
اک سمندر کی پیاس ہیں یہ لوگ

اور ایک بار پھر پنجاب کے المیہ کی جیتی جاگتی تصویر شعر کے قالب میں ہمارے سامنے آتی ہے اور ہمیں اپنے تاثر سے رلا جاتی ہے۔

جب کبھی دیکھتا ہوں غور سے سب حرف [illegible]
ان میں روتے ہوئے انساں نظر آتے ہیں
جا بجا جلتی ہوئی لاشیں مجھے ملتی ہیں
یعنی اخباروں پہ شمشان نظر آتے ہیں

جگر صاحب کی شاعری پر جتنا بھی لکھا جائے ایک تشنگی کا احساس باقی رہتا ہے خدا کرے کہ یہ تشنگی باقی رہے خاص طور پر شاعر کے دل میں خوب سے خوب تر کی جستجو کا برقرار رہنا لازم ہے اس سفر میں منزل نام کی کوئی چیز نہیں ہاں سہانے موڑ تو آ ہی جاتے ہیں لیکن جگر صاحب بخوبی واقف ہیں کہ ان پر منزل کا دھوکا کھا جانا کتنی بڑی بھول ہے لہٰذا پنجاب کا Poet Laureate آج بھی انکسار اور حلم کا مجسمہ نظر آتا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ جگر کو ابھی بہت آگے جانا ہے بہت زیادہ بہتر لکھنا ہے۔ آمین! ثم آمین!!

اِنتخابِ کلام